جامع الانوار

"من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہ"

(جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)

ابوالفارق واسطی

کتاب .... جامع الانوار
مصنف .... ابوالفارق واسطی
اشاعت .... پنجم
سنہ اشاعت .... فروری ۲۰۱۱
تعداد ۲۵۰
ہدیہ .... ۲۰۰ روپے
پبلشر .... حزب الطالبین کراچی
پرنٹر .... حُنین پرنٹر

ISBN: 969-8806-12-1

ملنے کا پتہ:
15 ایف، بلاک نمبر 2، پی ای سی ایچ ایس، کراچی

Ph:(021)-34551767

اسلام کا پہلا کلمہ

اسلام کا پہلا کلمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیارے بھائیو مسلمانو! رسول کا کلمہ پڑھنے والو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ مسلمانوں پر کیسا بُرا وقت آیا ہوا ہے۔ دنیا میں ہر طرف مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے۔ ان کے گھر جلائے جارہے ہیں۔ جائدادیں اور سامان معیشت تباہ و برباد کیا جارہا ہے۔ تمہاری بہنوں کی آبروریزی کی جارہی ہے۔ ان کی گودوں سے بچے چھین کر ماؤں کے سامنے ان کو ذبح کیا جارہا ہے۔ اسلام کے دشمن اسکیمیں بنارہے ہیں تاکہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم سوچیں اور غور کریں کہ رَب سچا، اُس کا کلام سچا۔ وہ تو فرماتا ہے اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴿۱۳۹﴾ آلِ عمران۔ (تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو گے) مگر اب تو کروڑوں مسلمان مومن ہونے کے مدعی ہیں مگر مغلوب ہی ہوتے جاتے ہیں۔ افسوس یہ کیسے مومن ہیں کہ غالب نہیں ہوتے۔

کیوں، کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ہمارا ایک کمبل پوش درویش مشرکوں کے ملک میں جاکر جہاں جھنڈا گاڑ دیتا، مشرکین کی فوجیں اس کو ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا سکتیں، کتنے ہی صاحبانِ معرفت اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں جو تنِ تنہا یا چند ہمراہیوں کے ساتھ کفار کے ملک میں آئے اور کسی ظالم حاکم کو تخت سے اتار کر اس کے ہی کسی عزیز کو جو رعایا کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا ہوتا تخت پر بٹھا دیتے۔ ظالم حکمرانوں کی افواج ان کی قوتِ ایمانی کے مقابل عاجز آجاتیں۔ اس طرح یہ اللہ کے محبوب بندے خدا کے فرمان کا عملی ثبوت دنیا کے سامنے پیش کردیتے کہ دیکھو ایمان والے ہی غالب رہتے ہیں۔

یہ محض قصّے کہانیاں تو نہیں ہیں۔ ان واقعات پر تو تاریخیں شاہد ہیں۔ اِن اولیاء اللہ کے

حالات ہر سال اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اِن اولیاء اللہ رحمتہ اللہ علیہم کے حالات ہی کا مطالعہ کرلو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کے غالب رہنے کا ثبوت دے کر رَب کے کلام کی صداقت دکھلا دی۔

کیوں پیارے بھائیو! کیا ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ ہم اس پر غور کریں کہ وہ کونسا اسلام اور کونسا دین تھا جس پر یہ اولیاء اللہ عامل تھے اور وہ کیسا ایمان تھا جو ان کے قلوب میں تھا جس سے ہم محروم ہیں۔ ان اولیاء اللہ کے عُرس تو دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں، ان کے کارناموں پر ہم وَجد کرتے ہیں مگر کبھی اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ اس پر غور کریں، کہ ان کی تعلیم کیا تھی؟ وہ ہمیں کس راستے کی طرف بلاتے تھے؟ ان کا مقصد تو حق کی طرف بلانا تھا مگر ہم تو ان کے مقصد کی جڑ ہی کاٹتے رہتے ہیں، ان کی دعوت پر لبیک کہنے پر تیار نہیں ہوتے۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں خود اپنے وقت کے قلندر حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کا کلام ہی دیکھیں اور اس کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ تو فریاد کرتے چلے گئے مگر کسی کے کان میں ان کی آواز نہ پڑی۔ انہوں نے تو صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے کہ اولیاء اللہ کا دین اور اسلام کیا ہے۔ وہ تو فرماتے ہیں ؎

فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
قلندر جُز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا

یعنی اولیاء اللہ کے دین کی بنیاد لا الٰہ پر قائم ہے جب دل کی گہرائی میں لا الٰہ اتر جائے تب ہی الا اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من قال لا الہ الا اللہ و جبت لہ الجنة۔ (جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا اس پر جنت واجب ہوگئی)۔

ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے میں نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا ہے لہٰذا جنت مجھ پر واجب ہوگئی۔ مگر افسوس یہ نہیں جانتا کہ بت پوجتے ہوئے، بے شمار معبودوں کی بندگی کرتے ہوئے اگر زبان سے لا الہ الا اللہ

کہہ لیا تو اس سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں ؀

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ تو اعلان کر گئے، پکار پکار کر کہہ گئے کہ مسلمانوں کی آستینوں میں بت رکھے ہوئے ہیں جو اُن کے معبود ہیں جن کو اُنہوں نے اِلہ بنایا ہوا ہے۔مگر مجھے یہ حکم ہے کہ اُن سے پکار پکار کر کہہ دُوں کہ سوائے اللہ کے کوئی بندگی واطاعت کے لائق نہیں ؀

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا اِلٰہ الاّ اللہ

پیارے بھائیو! ان اولیاء اللہ کے دین، ان کے اسلام اور ان کی تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کرنا اب تو نہایت ضروری ہوگیا ہے۔اب تو بہت نازک وقت آگیا ہے۔اب بھی اگر اس دین کی طرف توجہ نہ کی اور اس کی طلب بھی دلوں میں پیدا نہ ہوئی تو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جاؤ گے۔اُن کا دین اُن کا اسلام وہی ہے جو قرآن کریم میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے۔کہ رسولِ کریمؐ کی بعثت کا مقصد کیا ہے؟ اِس کے لئے دیکھو سورہ جمعہ۔ارشادِ ربُّ العزت ہے۔

هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ ۝۲ جمعہ

وہ وہی ذات اقدس ہے جس نے اہل مکہ میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا تاکہ ان پر اس کی آیات تلاوت کرے اور ان کو پاک کرے (تا آخر)

کلام پاک میں اس مضمون کی متعدد آیات موجود ہیں۔ہر ایک میں رسولؐ کی بعثت کا مقصدِ وحید یہی بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو پاک کرے مگر ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس چیز کو پاک کرے۔اجسام کو، قلوب کو، لباس کو یا ذہنوں کو، اِس کے لئے دیکھیں سورہ والشّمس۔ارشادِ باری ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ شمس

قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے پورا کیا۔ پس الہام کردیں اس پر اس کی برائیاں اور پرہیز گاری۔ فلاح اس نے پائی جس نے اس کو پاک کیا۔

اب تو بالکل واضح ہوگیا کہ رسولِ پاکؐ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ بندوں کے نفسوں کو پاک کرے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاک کرنا تو نجاست دور کرنے کو کہتے ہیں تو نفسِ انسان میں وہ کون سی نجاست ہے جس سے پاک کرنے کے لئے خدا نے اپنے رسولؐ کو بھیجا۔ تو وہ نجاست بھی قرآن کریم نے بتلادی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ۝۲۸ توبہ (سوائے اس کے نہیں کہ مشرک نجس ہیں)۔

اب تو واضح ہوگیا کہ وہ نجاست جس سے بندوں کے نفوس کو پاک کرنے کے لئے خدا نے اپنے محبوب کو رسولؐ بنا کر بھیجا، نجاستِ شرک ہے۔ ہم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ شرک تو کئی خدا ماننا، متعدد معبودوں کی عبادت کرنا ہے۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ خدائے واحد کو مانتے ہیں۔ ہم تو شرک میں مبتلا نہیں۔ ہمارے نفوس میں نجاستِ شرک ہے ہی نہیں۔ ہمارے نفس تو اس نجاست سے پاک ہیں۔

افسوس اگر ہمارے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو قرآن کریم میں صاف نظر آجائے کہ خدائے واحد کو مان کر بتوں کی یا دیگر معبودوں کی بندگی چھوڑ کر تو شرکِ ظاہری سے نکلتا ہے۔ شرکِ حقیقی یا شرکِ باطنی کی نجاست تو نفس کے اندر بھری رہتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝۶۵ عنکبوت

جب کشتی میں وہ سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد سے اللہ کو پکارتے ہیں اور جب ان کو نجات دے کر خشکی پر لے آتا ہے تو اک دم مشرک ہوجاتے ہیں۔

اس آیہ وافی ہدایہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں خدا کو واحد ماننے والوں کا حال ہی بیان کیا گیا ہے کہ سچے اعتقاد سے خدا کو صرف اتنی ہی دیر مانتے ہیں جب تک ہلاکت کا خطرہ سامنے رہتا ہے اِدھر

خطرہ ٹلا پھر وہ اعتقاد بھی ختم ہو جاتا ہے اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کی آیتیں کلام پاک میں موجود ہیں کہ مصیبت کے وقت تو اللہ کو خالص اعتقاد سے پکارتے ہیں، جب وہ ٹل جاتی ہے تو پھر مشرک ہو جاتے ہیں۔ اس شرکِ حقیقی یا شرکِ باطنی کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ جب تک نفس و کیفیاتِ نفس کا مطالعہ نہ کریں یہ سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا نفس و کیفیاتِ نفس کا مطالعہ کرنا ضروری اور لازمی ہے تاکہ لآ الٰہ الاّ اللّٰہ کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں۔

●●●●●

نفس و کیفیاتِ نفس

پہلا سوال یہ ہے کہ نفس کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جان جو ہمارے جسم میں ہے اِسی کو نفس کہتے ہیں۔ یہ نہایت لطیف گیس کا غیر مرئی جسم ہے جو ہمارے گوشت پوست کے جسم سے بالکل مشابہ ہے اور اس میں سرایت کئے ہوئے ہے یہی جسم پر حاکم ہے اور ہر وقت جسم پر حکم چلاتا رہتا ہے اسی لئے اس کو نفسِ امّارہ (بہت حکم چلانے والا) کہتے ہیں۔ عام اصطلاح میں اِسی کو رُوح بھی کہہ دیا جاتا ہے مگر حقیقتاً یہ رُوح نہیں ہے۔ رُوح اور چیز ہے۔ اس کا اس مقام پر ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

نفسِ امّارہ کے پاس حصولِ علم کے پانچ ذرائع ہیں:۔

① باصرہ (دیکھنے کا حس)

② سامعہ (سننے کا حس)

③ ذائقہ (چکھنے کا حس)

④ شامّہ (سونگھنے کا حس)

⑤ لامسہ (چھونے کا حس)

یہی پانچوں حواس خمسہ ظاہری کہلاتے ہیں۔ بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے تو جو کچھ وہ دیکھتا ہے، ہر پلک جھپکنے پر اُس کی تصویر نفس پر بنتی ہے۔ سننے سے آوازوں کے نقوش اِس پر بنتے ہیں۔ چکھنے سے ذائقہ کی کیفیات اِس میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔ سونگھنے سے خوشبو و بدبو کے احساسات کا خزانہ اِس میں جمع ہوتا ہے اور چھونے سے لمس کی کیفیات سردی، گرمی، سختی، نرمی وغیرہ کے احساسات کا ذخیرہ نفس میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا کسی بات کے جاننے یا سمجھنے کا انحصار اِس کے جمع شدہ احساسات ہی پر ہے۔

مثلاً جو چیزیں اِس نے پہلے دیکھی ہوں، اُن میں سے کسی کا نام لیں جیسے ''سفید مرغ''، ''سفید مرغ''، اِس سے سننے والوں کے ذہن میں سفید مرغ کی تصویر ابھرتی ہے مگر جو چیز پہلے دیکھی نہ ہو، جیسے کسی نے گُلدار کبھی نہ دیکھا ہو اس کے سامنے گلدار گُلدار کہے جائیں اُس کے نفس پر کوئی اثر نہ ہوگا یا مثلاً ''کامنی''، ''کامنی'' سننے سے جس نے کامنی دیکھی نہ ہو اُس پر مطلق اثر نہ ہوگا۔

اسی طرح ذائقہ، اگر کسی کے سامنے ایسے ذائقہ کا ذکر کریں جو اس نے چکھا ہو تو نفس اپنے خزانوں میں سے نکال کر اُسی ذائقہ کی خفیف کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے سمجھتا ہے مثلاً کسی کے سامنے کہیں ''ارے کتنی کھٹی املی چبا رہا ہے''، ''اُف کتنی کھٹی'' تو ہر سننے والے کے منہ میں پانی آ جاتا ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ اس کے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اصل یہ ہے کہ نفسِ امّارہ اپنے خزانوں میں سے تُرشی نکال کر لاتا ہے اور اپنے اوپر طاری کر کے سمجھتا ہے۔

اب اِس پر غور کریں کہ ہر دم و ہر لحظہ اِس میں تصاویر کے، ذائقوں کے، آوازوں کے اور تمام دیگر کیفیات واحساسات کے خزانے جمع ہوتے رہتے ہیں اور ہر مقرر کی تقریر سنتے ہوئے ہر لفظ کے لئے اپنے خزانوں سے اُس کی تصویر یا کیفیت نکال کر لاتا ہے اور اُس سے ملا کر سمجھتا جاتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ کرتے ہوئے کیا کسی شخص کو کبھی اس کا احساس ہوتا ہے کہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے؟ حالانکہ یہ کام ہر وقت مسلسل ہوتے رہتے ہیں اور خود نفس ہی سب کچھ کر رہا ہے مگر اِس کو بالکل اِس کی خبر نہیں کہ میں کچھ کر بھی رہا ہوں۔ یہ ہے اِس کی غفلت ولاشعوری، جس کے لئے رَبّ العزّت نے اپنے کلام پاک میں بہ تکرار ارشاد فرمایا ہے:۔

فَهُمۡ غٰفِلُوۡنَ وہ تو غافل ہیں۔

وهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ اور ان کو شعور نہیں۔

اسی کے لئے ارشاد ہے:۔

اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ۝٢ التکاثر — تمہیں تو ہوس نے ہی غفلت میں رکھا یہاں تک کہ تم قبروں سے ملے۔

اور اسی کے لئے حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا (لوگ تو سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے)۔

یہ حدیث گویا آیۂ مذکورہ کا ترجمہ ہے۔ اب تو یورپ و امریکہ میں تمام اہل علم بھی یہ کہتے ہیں:۔

"Human mind is in a subconscious state for the exterior world but totally unconscious of its interior".

یعنی نفسِ انسان خارجی دنیا کے لئے نیم شعوری حالت میں ہے مگر اپنے باطن کے لئے مطلقاً لاشعور ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات تیرہ سو سال قبل بتلادی تھی۔ آج دنیا کی سمجھ میں آئی ہے۔ تمام اہلِ علم اس پر ایمان لے آئے اور رسول اسلام کے قول کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض یہ کہ نفس کی غفلت و لاشعوری ہی وہ نجاست ہے جس سے نفوسِ خلق کو پاک کرنے کے لئے خدا نے اپنے رسولؐ کو بھیجا۔

غفلت و لاشعوری کے ہلاکت خیز نتائج

اگر نفس کی غفلت کم ہو جائے تو یہ مادہِ فاسد کو جسم میں جمع نہ ہونے دے تو انسان امراض میں مبتلا نہ ہو۔ زہریلے جراثیم جسم میں داخل ہوتے رہتے ہیں مگر نفس کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ جب ان کی کثرت ہو جاتی ہے تو وبائی مرض مثل ہیضہ یا طاعون ظاہر ہوتا ہے۔ اگر غفلت کم ہو جائے تو زہریلے جراثیم کو داخل ہی نہ ہونے دے۔ پھر انسان ہلاکت خیز امراض سے محفوظ رہ سکے گا۔

امریکہ میں تجربات کر کے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ مسمریزم کا عامل اگر معمول سے اس کی بے ہوشی کی حالت میں یہ کہہ دے کہ ''فلاں روز دریا میں چھلانگ لگا دینا'' تو یہ بات اس کے تحت الشعور (Subconscious mind) میں بیٹھ جاتی ہے۔ پس جب وہ دن آئے گا تو وہ شخص بے خبری میں دریا میں ضرور چھلانگ لگائے گا۔ اس کو اس کی خبر نہ ہوگی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟

تمام کائنات کا نظام غیر مرئی نوری شعاعوں پر قائم ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے جیسا اس کا ارشاد ہے:۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴿۳﴾ الاعلیٰ (وہ وہی ہے جس نے قانون بنائے اور ہر شے کو ہدایت کر دی)۔

پس خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق تمام کائنات میں عملدرآمد جاری و ساری ہے۔ جس طرح سورج اور چاند کی شعاعیں ہمارے جسم پر ہمارے نفس کے خواہشات و جذبات پر اثر انداز ہوتی ہیں، اسی طرح تمام کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں اور نامعلوم جہانوں سے آنے والی غیر مرئی نوری شعاعوں (Cosmic Rays) کے اثرات نفس میں جمع ہوتے رہتے ہیں ان میں بہت سی شعاعیں ایسی بھی ہیں جن کے اثرات مہلک ہوتے ہیں۔

جو شعاعیں کسی شخص کے لئے مضر ہوتی ہیں، ان کے مہلک اثرات اس کے لاشعور میں جمع ہوجاتے ہیں اور وقت معین پر ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہونے، پانی میں غرق ہوجانے، سیلاب یا سائیکلون میں تباہ ہونے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی کو جناب رب العزت نے اپنے کلام پاک میں اس طرح ظاہر فرمایا ہے:۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ ﴿۲۲﴾ (الحدید)

اور نہیں پہنچتی تم کو کوئی مصیبت زمین میں اور نہ خود تمہارے نفسوں میں مگر یہ کہ وہ پہلے سے کتاب میں موجود ہوتی ہے قبل اس کے ہم اس کو ظاہر کریں۔

یعنی وہ مہلک اثرات پہلے سے تحت الشعور (Subconscious mind) میں موجود ہوتے ہیں۔ وقت آنے پر دفعتاً ظاہر ہوجاتے ہیں اور وہ بلا نازل ہوجاتی ہے۔

غرض یہ کہ تمام آفاتِ ارضی وسماوی، دنیا کے تمام کاموں کی خرابی، دین کے سارے امور کی خرابی اور جو بھی بُرے اور مضر افعال انسان سے صادر ہوتے ہیں، اُن تمام کی علت اور ان کا سبب نفس کی غفلت ولاشعوری ہی ہے۔

غفلت کی حالت میں اس کی فطرت ہے کہ جو خواہش بھی اس کو ہوتی ہے۔ اس کی فوری تسکین چاہتا ہے۔ یہ آدمی کو سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیتا۔ سوچنے دیتا ہے تو صرف یہ کہ خواہش کی تسکین کیسے کروں؟ کسی خواہش یا جذبہ کا جوش ہوتے ہی فوراً اس کی تسکین کرتا ہے مثلاً کسی سے ترش کلامی ہوگئی، غصہ آگیا، چھری نکال لی اور مخالف کو ہلاک کردیا پکڑے گئے پھانسی پائی۔ بے سوچے سمجھے، بے چوں و چرا جس کے حکم کی تعمیل لازم ہے وہ تو بس معبودِ حقیقی ہی کی ذات ہے یہ منزلت تو اسی ذوالجلال والاکرام کے لئے ہی خاص ہے کہ اس کے حکم کی بے سوچے سمجھے تعمیل کی جائے۔ اِسی لئے نفسِ امّارہ کے احکام کی بے سوچے سمجھے تعمیل کرنے کو قرآن شرک کہتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۙ﴿۴۳﴾ فرقان (اے رسولؐ) کیا تم نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفس کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے۔ پس تم اس کے کارساز کیسے ہو سکتے ہو؟

یعنی جس نے اپنی خواہشات و جذبات کو ہی اپنا معبود بنایا ہوا ہو کہ بے سوچے سمجھے ان کی تعمیل کرتا ہے، اس کو تمہاری نبوت و ہدایت سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اس کے دنیا و آخرت کے کام کیسے درست ہو سکتے ہیں؟

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے:۔

اِنَّ اَکۡبَرَ مَعۡبُوۡدٍ عِبِدَ فِی الدُّنۡیَا الۡهَوٰی (سب سے بڑا معبود جس کی دنیا میں عبادت کی جاتی ہے خواہش نفس ہے)۔

اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ ہے یعنی سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ پس اگر ہم اپنی خواہشات کی بے سوچے سمجھے تسکین کرتے رہیں۔ نفسِ امّارہ کے ہر حکم کی بے چون و چرا تعمیل کریں تو ہم نے تو نفس ہی کو الٰہ بنایا ہوا ہے۔ ہم نے لا الٰہ دل سے کہا ہی نہیں۔ ہم تو غیر اللہ کی بندگی میں مصروف ہیں تو گویا مطلب یہ ہوا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ اس سوئے ہوئے نفس کو جگانے اور اس کی غفلت دور کرنے کی کوشش کی جائے جس کے کم ہونے سے ہی ہمارے دین و دنیا کے کام درست ہو جائیں۔

ظاہراً تو یہ خدا اور رسول اور تمام اشیاء غیب کے متعلق عقائد کو مان لیتا ہے مگر سوئے ہوئے ہونے کی حالت میں اس کے عقائد تو ہوا پر ہیں، ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں، جب جاگے گا تو اس نے کچھ بھی مانا ہوا نہ ہوگا۔

ایک بیماری مشی فی النوم (Somnabulism) یعنی ''سونے میں چلنا پھرنا'' ایسی ہوتی ہے کہ اس کے دورے کی حالت میں آدمی سوتے میں کھڑا ہو جاتا ہے، چلتا پھرتا ہے، باتیں کرتا ہے، کام کرتا ہے مگر جب دورے سے افاقہ ہوتا ہے اور ہوش میں آتا ہے تو اسے کچھ بھی یاد نہیں ہوتا۔

پس جب ہمارے نفس کا بھی یہی حال ہے کہ بالکل غافل سویا ہوا ہے تو اس کے عقائد کہ خدا کو، رسول کو، قیامت کو مان لیا ہے کیا حقیقت رکھتے ہیں؟ موت کے وقت جب جاگے گا تو اس نے کچھ بھی مانا ہوا نہ ہوگا۔ خدا اور رسول نے تو اس کو جگانے کے طریقے بتلا دیئے ہیں۔

ایک سہل طریقہ تو یہ بتلایا گیا کہ ہر خواہش اور اس کے عمل کے درمیان اس کو ٹوکنے کی عادت ڈالو، جیسا کہ ارشاد باری ہے:۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ نازعات

اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہشوں سے روکا، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

اسی کے لئے ہر نماز میں دو مرتبہ سورہ حمد پڑھنے کا حکم ہے کہ بندہ صدق دل سے عرض کرتا رہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ ہمیں اپنے سیدھے راستہ پر چلا یعنی اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنی رائے پر عمل کرنے سے جو ہماری ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں، باز رکھ۔

پس جو شخص صدقِ دل سے یہ دعا کرتا رہے گا وہ چند ہفتے ہی میں اس کا اثر بھی محسوس کرے گا۔ جو اتنا بھی نہ کر سکے وہ جانوروں کی طرح نیچر کا محکوم رہے گا۔

غور کریں کہ انسان کی زندگی کے تمام کام تحریکِ باطن سے ہوتے ہیں اور تحریکِ باطن جذبہ سے، جذبہ خواہش سے، خواہش خیال سے اور خیال ماحول کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی زندگی کے تمام کام مہیجِ خارجی کا ردِّ عمل ہوتے ہیں۔

پس یہ تو نیچر کے کوڑے سے اسی طرح ہنکایا جاتا ہے جیسے جانوروں کو چرواہا ڈنڈے سے ہنکائے پھرتا ہے۔ اس کا کوئی فعل ارادی نہیں ہوتا، حالانکہ ہمارا خالق تو فرماتا ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔

اللہ نے ساری مخلوق کو جو زمین میں ہیں تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔

خالق نے تو ہمیں اشرف المخلوقات بنایا تھا تا کہ انسان اُس کی نیابت میں تمام دوسری مخلوقات پر حکومت کرے مگر یہ تو خود نیچر کا غلام بنا ہوا ہے۔

مسلمانو! کلمہ کی عظمت سمجھو۔ ذرا بھی نفس کی غفلت کم ہوجائے تو ہزاروں غلطیوں سے بچ جائے۔ بے شمار آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ ہوجائے۔ دنیا کے کام بھی درست ہوجائیں اور آخرت کے عذابِ دائمی سے بھی نجات ملے۔ وہی قوم سربلند ہوتی ہے جو فطرت کے راز معلوم کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔ اس کے لئے سب سے پہلے فطرتِ نفس کا مطالعہ ضروری ہے جس کے بعد علومِ فطری کی تحصیل سہل و آسان ہوجاتی ہے۔

قارئین کرام پر یہ امر واضح ہوگیا کہ ہمارے نفوس پر تمام حرکات وسکنات جو بچپن سے اس وقت تک ہم سے صادر ہوئے، ہر بات جو کہی یا سنی، ہر فعل جو کیا، ہر ذائقہ جو چکھا، ہر شے جو دیکھی، ہر خوشبو یا بدبو جو سونگھی، ہر چیز جو چُھوئی، ہر کیفیت جو وارد ہوئی، ہر حس یا احساس جو ہوا سب کے نقوش ہمارے نفس پر موجود ہیں۔ جو نُوری قوتیں ہر دم و ہر لحظہ نفس پر لکھتی یا نقش کرتی رہتی ہیں۔ یہی ہمارا نامۂ اعمال ہے۔ جس میں کسی طرح کا شک وشُبہ نہیں ہوسکتا۔ اِسی کو ربُّ العزت اپنی کتاب میں کہتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ الجاثیہ

یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر حق ہی حق بولے گی۔ ہم تو لکھتے رہتے تھے جو کچھ تم کرتے رہتے تھے۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿١٤﴾ الاسراء

اپنی کتاب پڑھ لے۔ آج تو اپنے نفس کا حساب کرنے کے لئے خود ہی کافی ہے۔

غرض یہ کہ ہمارا نامۂ اعمال تو یہ ہمارا نفس ہی ہے مگر دوسری تیسری صدی ہجری میں فلسفۂ یونان پر بِنا کر کے اور اُن روایات کو جو خلفاء بنی امیہ و بنی عباس نے وضع کرائی تھیں [1]، احادیثِ رسولؐ جان کر

---

[1] سیرت النبی از مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۴۲۸،۶

جس اسلام کی تشکیل کی گئی اور جو مذہب وضع کیا گیا اس موضوعہ وقیاسی دین اسلام کے علماء کہتے ہیں کہ :۔

"تمہارے کندھوں پر دو فرشتے ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے کاغذ ہیں، جن پر وہ تمہارے اعمال ہر وقت لکھے چلے جاتے ہیں اور ہزاروں رِم کاغذوں کا بوجھ تم اٹھائے پھر رہے ہو"۔

اسی طرح اس روایتی موضوعہ دین کے علماء نے فلسفہ کے زیر اثر اور روایات موضوعہ سے اس مقدس دین فطرت کو اپنے قیاس سے مضحکہ خیز عقائد کا پلندہ بنا دیا ہے [۱]۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اس عظمت والے کلمے کو خود سمجھیں اور اپنے نادان غیر تعلیم یافتہ بھائیوں کو سمجھائیں۔جس سے اُن کو خودی کا احساس ہو اور ہمتیں بلند ہوں۔احساسِ کمتری دُور ہو اور پاکستان دنیا بھر میں سر بلند ہو جائے۔

فی زمانہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اور کالجوں میں کمیونزم کا بہت منظم پروپیگنڈہ جاری ہے ان پروپیگنڈہ کرنے والوں سے پوچھو، تمہارے پیغمبر مارکس نے دنیا کے ان مصائب وآلام سے محفوظ رہنے کا بھی جو نفس کی غفلت ولاشعوری کے سبب نازل ہوتے ہیں، کوئی طریقہ اور ان کا علاج بتلایا ہے؟ کیا اُس کو خود بھی اِس کا پتہ تھا کہ اُس کا اپنا نفس غفلت ولاشعوری میں غرق ہے۔اِس غفلت ولاشعوری کی حالت میں انسان کے کام کبھی درست نہیں ہو سکتے۔

نفس امارہ کی تو فطرت ہے :۔

"میں سب سے اچھا، میں سب سے بڑا، میری رائے سب سے بہتر و درست ہے"۔

کمیونسٹ ممالک میں دیکھو، جب تک ایک پارٹی برسر اقتدار رہتی ہے، مخالف پارٹی پوشیدہ رہتی ہے۔وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔جیسے ہی دوسری پارٹی کو قوت واقتدار حاصل ہوتا ہے، وہ پہلی کو

---

[۱] یہ درست ہے کہ نفسِ انسان پر نقوش فرشتوں کے ذریعے سے ہی بنتے ہیں جن کو "کراماً کاتبین" کہا گیا ہے۔کائنات میں تمام کام فرشتوں کے ذریعہ ہی ہوتے رہتے ہیں۔

فنا کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

صرف روٹی سے کبھی امن قائم نہیں ہوسکتا۔ بغیر اصلاحِ نفس دنیا میں امن وسکون ہونا محال ہے۔ روٹی کے پیچھے تو کتّے، کوّے بھی دوڑتے پھرتے ہیں۔ اگر آدمی بھی جانوروں کی طرح صرف کھانے پینے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ لے تو وہ چوپاؤں کی مثل ہی ہوگا۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ ذلیل، جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ⑫ محمد	اور وہ لوگ جو فطرت سے روگردانی کئے ہوئے ہیں (دنیا میں) کچھ فائدہ پاتے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

یعنی ان کو اطمینانِ قلب کبھی حاصل نہ ہوگا۔ اسلام فطرت پر غلبہ دینے کا وعدہ کرتا ہے وہ اطمینانِ قلب جیسی نعمت عطا کرنے کی ضمانت دیتا ہے، جو سونے چاندی کے خزانوں اور دنیاوی سلطنت مل جانے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

جن اشخاص کے قلوب میں اسلام کی محبت ہوگی، وہ تو اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کی ترغیب دیں گے اور خود بھی بہ تکرار مطالعہ کریں گے۔ اس لئے کہ کیفیاتِ نفس کا احساس ایک دو مرتبہ دیکھ لینے سے نہیں ہوتا۔

اب جبکہ کیفیات وغفلتِ نفس کا کچھ بیان سامنے آ گیا ہے، اور اسلامِ حقیقی کا کچھ نہ کچھ تصور بھی واضح ہوگیا ہے۔ ناظرین پر اسلامِ حقیقی کی اسپرٹ اور تعلیمات جو سکونِ قلب اور مسرتِ ابدی کی ضامن ہیں اور خلافِ عقل وفطرت روایتی مذہب جو اسلام کے خودساختہ نمائندے وترجمان (علماء ومجتہدین، مدعیان نبوت ومہدیت) پیش کرتے ہیں، کے درمیان فرق عیاں ہو جائے گا۔

بھلا اس سے زیادہ کیا حماقت ہوسکتی ہے کہ جن اشخاص کو نفس کے ''ن'' اور فطرت کی ''ف'' کا بھی علم نہ ہو، جو غفلت ولاشعوری کا مفہوم بھی نہ جانتے ہوں، جو خود ہی غفلت ولاشعوری کی تاریکیوں میں

گھرے شرکِ باطنی میں مبتلا ہوں۔ اُن کو خدا کا فرستادہ باب اللہ، بہاء اللہ، نبی، رسول، مجدد، مہدی یا عالمِ دین مان کر ان کی پرستش میں مصروف ہوں وہ تو بُت پرستوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ بُت پرست تو صامت بتوں کو پوجتے ہیں اور یہ بولتے بتوں کو پوج رہے ہیں۔ ایسے افراد تو اس آیت کے پورے پورے مصداق ہیں:۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ اعراف

اور ہم نے جہنم کے لئے بہت سے جن اور انسان پیدا کئے۔ ان کے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں۔ ان سے سنتے نہیں۔ وہ تو ڈھوروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ وہ وہی ہیں جو بالکل غافل ہیں۔

اب جس کے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والا دل ہوگا وہ تو دیکھ لے گا اور سمجھ لے گا کہ جناب رَبُّ العزت اہلِ جہنم کی علامت یہی بتلا رہا ہے کہ وہ بالکل غافل ہیں۔ پس جو لوگ غفلت کا مفہوم بھی نہ جانتے ہوں جو خود ہی غافل ہوں ان کو نبی، مجدد، مہدی یا عالم دین مان لینے والوں کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟

ان پیشواؤں کی غفلت کا ثبوت یہی کافی ہے کہ اگر وہ غافل نہ ہوتے تو غفلت کا مفہوم کبھی نہ کبھی بتلاتے، اگر وہ ''لا الٰہ'' کے حقیقی مفہوم سے واقف ہوتے تو کہیں تو تقریر یا تحریر میں واضح کرتے۔

اب جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہوں گی وہ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ جناب رَبُّ العزت نے اپنے کلامِ پاک میں ظاہر فرما دیا ہے کہ:۔

''اس میں بہت تھوڑی آیات محکم ہیں، وہی اصل کتاب ہیں باقی تمام قرآن متشابہ ہے اور متشابہ کے پیچھے وہ چلتے ہیں جن کے دل ٹیڑھے ہو گئے یعنی جو گمراہ ہیں''۔ (آل عمران: ۷)

پس جن مدعیان نبوت، مجددیت، مہدیت یا علماء دین کو محکم و متشابہ کے درمیان تمیز کرنے کی

اہلیت نہ ہو اور خود ہی متشابہات کی پیروی کرتے ہوئے گمراہی کے تاریک غار میں پڑے ہوں، ان کو پیشوائے دین ماننے والے گمراہی کی کس پست و تاریک منزل میں ہوں گے۔

اب میں اپنے برادرانِ دینی کی خدمت میں بصد عجز گزارش کرتا ہوں کہ اس وقت جو دنیا میں ہمارے بھائیوں پر مظالم ہو رہے ہیں، ان کو یاد رکھتے ہوئے بارگاہ رَبُّ العزت سے صدق دل سے دُعا کرتے رہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی اے رَب ہمارے ہمیں نفس و شیطان کی بندگی سے بچا لے اور اپنا سیدھا راستہ دکھا اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے حال پر رحم فرما۔

فالحمد للہ رب العلمین

خدا کو مانو!

خدا کو مانو!

برادران اسلامی! جناب حافظ بشیر احمد صاحب غازی آبادی کا وہ مضمون جو ''روزنامہ جنگ کراچی'' مورخہ ۲۳؍دسمبر ۱۹۶۷ء کے صفحہ ۵ پر زیرِ عنوان ''غزوہ بدر'' شائع ہوا تھا، غالباً آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس صفحہ کے کالم نمبر ۴ پر تھا:۔

''جب معاندین اسلام کے بے رحمانہ اور سفاکانہ برتاؤ نے جاں نثارانِ اسلام پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو صرف تین سو پانچ یا تین سو تیرہ مجاہدین نے جن کے پاس سامانِ جنگ میں کل دو علم، ستر (۷۰) اونٹ اور برائے نام اسلحہ تھا، سات سو اونٹ، تین سو گھوڑے اور ایک ہزار سے زائد مسلح سپاہیوں پر مشتمل فوج کا مقابلہ کیا۔

اسبابِ ظاہری میں اس بے سرو سامانی اور لاؤ لشکر کا کیا مقابلہ؟ ظاہر ہے کہ عدم توازن اپنی حد پر تھا۔ لیکن خدا فراموشوں کو ان انفاسِ قدسیہ نے ایسی عبرتناک شکست دی کہ نہ صرف یہ کہ الحادی سیلاب کو بند لگ گیا بلکہ ہمیشہ کے لئے کفر نادم ہوا، اور رہتی دنیا تک یہ معرکہ حق و باطل فرزندانِ توحید کے لئے باعث شرف ہو گیا۔

وہ لشکرِ جرار جو سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ہمیشہ کے لئے چراغِ اسلام کو گل کرنے کے لئے آیا تھا، ناکام و نامراد ہوا اور اس کی اکثریت مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔ جواں مردوں کے سامنے سامانِ جنگ کی افراط اور افواج کی اکثریت کچھ کام نہ آئی۔ حق قلت کے باوجود غالب آیا اور باطل کثرت کے ہوتے ہوئے مغلوب ہوا''۔

اس مضمون کا تتمہ کالم نمبر ۵ اور نمبر ۶ پر تھا جو حسبِ ذیل ہے:۔

''مقامِ عبرت ہے کہ آج یہودی مسجدِ اقصیٰ پر قابض ہیں اور فرزندانِ توحید حسرت و یاس سے اس دلدوز نظارے کو دیکھ رہے ہیں۔ دنیائے اسلام کا قبلہ اوّل مسجدِ اقصیٰ جس کے درودیوار آج کروڑوں مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی کے منتظر ہیں، مغضوب یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔

وہ بیت المقدس جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور متعدد دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مزاراتِ مقدسہ ہیں، جہاں محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات دو (۲) رکعت نفل پڑھے، انبیاء کی امامت فرمائی اور پھر سیرِ ملکوت کے لئے تشریف لے گئے۔ وہ بیت المقدس جسے انبیاء کا شہر کہا جاتا ہے۔ جہاں حضرت فاروقِ اعظم، امیر المومنین حضرت عمر ابن خطابؓ کی مسجد ہے۔

اس قبلہ اوّل میں امسال مسلمان معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تقریب بھی نہیں منا سکے، غزوۂ بدر کے تین سو تیرہ مجاہدین کا فخر سے ذکر کرنے والے مسلمان جو آج دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں ہیں اور وسائل کی لامحدود طاقت رکھتے ہیں، خدا کے اس حکم سے کیوں غفلت اختیار کئے ہوئے ہیں کہ:۔

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔

اور خدا کی مدد کے معنی کیا ہیں کہ ظاہری اسباب پر قناعت نہ کرو۔ باطل کے سامنے سینہ سپر ہو کر آجاؤ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا تم کو فتح دے گا اور دشمنوں کا خوف دل سے نکال دے گا۔

یہی غزوۂ بدر میں ہوا، مسلمانوں نے اللہ کی یہ مدد کی کہ پرچمِ توحید و رسالت کی عظمت کے لئے سر بکف ہو کر میدان میں آگئے اور خدا نے ان کی یہ مدد کی کہ ان کو کامیاب و کامران بنایا''۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

لاریب اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں۔ یہ محض روایت تو نہیں بلکہ درایت ہے کہ تین سو تیرہ بے سروسامان مجاہدین نے ایک ہزار سے زائد مسلح لشکر پر تائیدِ ایزدی سے بہت بڑی فتح حاصل کی۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ خدا اور رسوؐل کو ماننے والے تھے۔

اب جو کروڑوں مسلمان ہیں، ان میں تلاش کرو کہ خدا کو ماننے والے کتنے ہیں تو مشکل سے گنے چُنے افراد ہی نکلیں گے۔ اب بھی اگر ہم خدا کو مان لیں تو نصرت و تائیدِ ایزدی ہمارے شامل حال ہو جائے۔ سب سے پہلی اہم ضرورت تو یہی ہے کہ ہم خدا اور رسوؐل کو دل سے مان لیں۔

آج اگر کسی مسلمان سے کہا جائے کہ خدا اور رسوؐل کو مانو تو شاید وہ کہنے والے کا منہ کھسوٹنے کو تیار ہو جائے گا اور کوئی بات سننے کو تیار نہ ہو گا۔ پھر وہ کسی کی بات سنے بھی کیوں؟ جب وہ خدا کی بات بھی نہیں سنتا اور اس کے کلام کو بھی جھوٹا سمجھتا ہے۔

کیا اس نے یہ آیت کبھی سنی یا پڑھی نہ ہو گی:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴿۱۳۶﴾ النساء

اے ایمان لانے والو۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ ﴿۲۸﴾ الحدید

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے:۔

''اے مسلمانو خدا کو زبانی ماننے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مان لو''۔

افسوس کہ ہم میں حق سننے کی بھی اہلیت نہیں رہی۔ جب ہم ان الفاظ کا مفہوم بھی نہ جانتے ہوں جو اپنی زبان میں روزمرہ بولتے ہیں تو عربی فارسی اور خصوصاً کلام اللہ کے الفاظ کے معنے کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ ایک اس لفظ ''مانتے'' ہی کو لے لیں اور اس کی چند تمثیلیں دیکھ لیں تو صاف واضح ہو جائے گا کہ ان کروڑوں مسلمانوں میں خدا کو ماننے والے شاذ ہی نکلیں گے۔

① آپ لوہار کی دکان پر بیٹھے ہیں۔ بھٹی کے پاس لوہے کے کچھ موٹے ٹکڑے پڑے ہیں جو ظاہراً دیکھنے میں گرم نہیں معلوم ہوتے۔ لوہار موجود نہیں۔ پنکھا چلانے والا لڑکا آپ سے کہتا ہے کہ یہ لوہے کے ٹکڑے بہت گرم ہیں مگر آپ نہیں مانتے۔ وہ لڑکا ایک ٹکڑے کو کپڑے سے پکڑ کر دکھاتا ہے۔ کپڑے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ اب آپ مان لیتے ہیں کہ ہاں یہ بہت تیز گرم ہے۔

اب یہ مان لینے کے بعد کیا آپ ایک ٹکڑا اٹھا لیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کیوں کہ آپ کو یقین ہے کہ ہاتھ جل جائے گا۔ پھر خدا کو یہ کیسا مانا ہوا ہے کہ اس کو مان کر بھی اس کی نافرمانیاں کرتے رہتے ہیں۔ لوہے کا ٹکڑا پکڑتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ ہاتھ جل جائے گا مگر رب کی نافرمانی کرتے ہوئے ذرا بھی خوف نہیں ہوتا لوہے کے گرم ہونے کا تو یقین ہے مگر خدا کے وجود کا یقین نہیں اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ خدا کا ماننا صرف زبانی اور فریب نفس ہی ہے۔

② شہر میں ایک ڈاکٹر باہر سے آکر دکان کھولتا ہے۔ ایک شناسا آپ سے کہتا ہے۔ یہ نیا ڈاکٹر ہیضہ کے علاج کا ماہر ہے۔ اس کے پاس اس مرض کی اکسیر ہے۔ مگر آپ نہیں مانتے بلکہ کہتے ہیں کہ نئی دکانوں کا اسی طرح پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ اتفاقاً شہر میں ہیضہ کی وباء پھیل جاتی ہے۔ شخصِ مذکورہ کہتا ہے اب آپ کو میرے قول کی سچائی معلوم ہو جائے گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جتنے مریضوں کا اس ڈاکٹر نے علاج کیا سب اچھے ہو گئے۔ اب آپ مان لیتے ہیں کہ بیشک وہ اس علاج کا ماہر ہے۔ پھر اگر آپ کی بیوی یا بیٹا خدانخواستہ ہیضہ میں مبتلا ہو جائے تو کیا دوڑے

ہوئے اس ڈاکٹر کے پاس نہیں جائیں گے؟ اور اس کی ہدایات پر عمل نہیں کریں گے؟ جائیں گے اور ضرور جائیں گے اور اس کی ہدایات پر عمل بھی ضرور کریں گے۔ اس لئے کہ ہلاکت کا خوف ہے۔ اسی کو ماننا کہتے ہیں۔

پھر خدا کو یہ کیسا مانا ہوا ہے کہ اس کو ہلاکت ابدی سے بچانے والا نہیں جانتے اور ہلاکت وعذاب دائمی سے محفوظ رہنے کے لئے اس کی ہدایات پر عمل نہیں کرتے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا یہ ماننا محض فریب نفس ہے نہ خدا کو دل سے مانا ہے اور نہ اس کے عذاب کی وعید کی سچا جانا ہے۔

۳ ایک گرہ کٹ بس میں سفر کر رہا ہے۔ اس کا ایک ساتھی کہتا ہے کہ سامنے والی بنچ پر پولیس سب انسپکٹر بیٹھا ہے۔ وہ نہیں مانتا۔ اب وہ اس کی وردی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی ضرورت سے اس نے اتار رکھی ہے۔ اب یہ مان لیتا ہے۔ اب اس کو سب انسپکٹر مان لینے کے بعد کیا یہ ممکن ہے کہ یہ اس کے سامنے کسی کی جیب کاٹے؟ نہیں یہ تو ممکن ہی نہیں اس لئے کہ یقین ہے کہ سب انسپکٹر دیکھ رہا ہے۔ اس کے سامنے اگر جرم کروں گا تو پکڑا جاؤں گا اور سزایاب ہوں گا۔

پھر خدا کو یہ کیسا مانا ہوا ہے کہ اس کو زبان سے حاضر و ناظر کہتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہمارے ہر حرکت وسکون کو دیکھ رہا ہے بلکہ ہمارے دلی خیالات کو بھی جانتا ہے۔ اس کے دیکھتے ہوئے جرائم و نافرمانیاں کرتے ہوئے ذرا بھی خوف نہیں ہوتا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے خدا کو اتنا بھی مانا ہوا نہیں ہے جتنا کہ اس جیب تراش نے سب انسپکٹر کو مانا ہوا ہے۔ اس کو سب انسپکٹر کی گرفت وسزایابی کا یقین ہے مگر ہمیں خدائے قہار کی گرفت وسزا کا یقین نہیں۔ اس پر یہ خیال کہ ہم نے خدا کو مانا ہوا ہے۔ فریب نفس ہی ہے۔ ہم نے دل سے خدا کو مانا ہی نہیں ہے۔ ہمیں اس کے وجود کا یقین ہی نہیں۔ اگر یقین ہوتا تو اس کی نافرمانیاں کیوں کرتے۔

۴ ایک بس میں سگریٹ سے آگ لگ جاتی ہے پھر کئی حادثے ایسے اور بھی پیش آتے ہیں

جس کے باعث بس میں سگریٹ پینا قانوناً جرم قرار دے دیا جاتا ہے اور پولیس کو دست اندازی کا اختیار مل جاتا ہے۔ آپ بس میں سفر کر رہے ہیں اور سگریٹ نکال کر جلانا چاہتے ہیں۔ آپ کا ساتھی کہتا ہے۔ بس میں پولیس کا آدمی موجود ہے۔ آپ مان لیتے ہیں اس کے بعد کیا آپ سگریٹ سلگا لیں گے۔ مجھے تو یقین ہے آپ سگریٹ ہرگز نہیں جلائیں گے کیونکہ آپ کو کانسٹیبل کی موجودگی کا یقین ہے مگر خدا کو زبانی مانتے ہوئے اس کی موجودگی کا یقین ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس کے وجود اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین ہوتا تو بے ایمانی، بد دیانتی، رشوت ستانی وغیرہ میں کیسے مصروف رہ سکتے تھے۔

۵ آپ چاند ماری کے پیچھے سے گزرنا چاہتے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے آج چاند ماری ہے۔ اس طرف سے جانا نہیں چاہئے۔ آپ نہیں مانتے۔ ناگاہ بڑے سائن بورڈ پر نظر پڑتی ہے، لکھا ہوا ہے:۔

''آج بروز جمعہ ۹ بجے دن سے ۱۲ بجے تک چاند ماری ہوگی، لہٰذا اس راستے سے کوئی نہ گزرے''۔

اب آپ مانے لیتے ہیں۔ اس کو مان لینے کے بعد آپ ہرگز ہرگز اس راستے سے گزرنے کی جرأت نہ کریں گے کیونکہ ہلاکت یا نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ یقین نہیں ہے مگر خدا کو اتنا بھی مانا ہوا نہیں ہے کہ اس کے عذاب کا خطرہ ہی محسوس ہو۔ یقین تو بڑی چیز ہے۔ لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارا یہ خیال کہ ہم نے خدا کو مانا ہوا ہے، محض فریب نفس ہی ہے۔

۶ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ سخت حکم ہے کوئی شخص تین فٹ لمبی لکڑی بھی لے کر نہ نکلے۔ آپ ساڑھے تین فٹ کی لکڑی ہاتھ میں لئے جا رہے ہیں۔ آپ کا ایک ساتھی کہتا ہے۔ ''چوراہے پر مجسٹریٹ کھڑا ہے ادھر سے نہ چلو یا لکڑی پھینک دو''۔ مگر آپ نہیں مانتے، لیکن جب مجسٹریٹ کے ساتھ دو سپاہیوں پر نظر پڑتی ہے تو مان لیتے ہیں کہ ہاں یہ مجسٹریٹ ہی ہے۔ اس کے بعد یا تو آپ لکڑی ہاتھ سے پھینک دیں گے یا اس طرف سے گزرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اس

لئے کہ گرفتاری کا خطرہ ہے مگر خدا کو مجسٹریٹ یا سپاہیوں کے برابر بھی نہیں مانتے کہ اس کو حاضر و موجود کہتے ہوئے اس کی نافرمانیوں میں مصروف ہیں۔

⑦ لائق غور امر یہ ہے کہ کسی کو حاکم ماننے کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہوتا ہے کہ اس کا حکم مانا جائے۔ پس خدا اور رسولؐ کا ماننا یہی ہے کہ ان کا حکم مانیں۔ پس اگر ان کے احکام کی اطاعت ہم نہیں کر رہے تو یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ہم نے خدا اور رسوؐل کو دل سے مانا ہی نہیں ہے، اور ہمیں خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین حاصل نہیں ہے۔

بہت سے مسلمان تو کہیں گے ہم نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اگر ہم نے خدا کو مانا ہوا نہ ہوتا تو ہم نمازیں کیوں پڑھتے؟ روزے کیوں رکھتے؟ زکوٰۃ کیوں دیتے؟ حرام جانوروں کا گوشت کھانے سے کیوں بچتے؟

افسوس کہ وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ نماز و روزے سے خدا کو تو کچھ پہنچتا نہیں۔ یہ تو خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہیں۔ نماز و روزے کا مقصد تو یہ ہے کہ ہم برائی سے بچ سکیں۔ خدا کا فرمان تو یہ ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴿۴۵﴾ عنکبوت	بے شک نماز بے شرمی کے کاموں اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

روزے، نماز، اوراد و وظائف کا تو مقصد وحید یہی ہے کہ بندہ خدا کو اس معنی میں مان جائے جو ماننے کے اصل معنی ہیں اور جب خدا کو دل سے مان لے گا تو اس کے دل میں ایسی قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ان کاموں سے بچنے لگے گا، جن سے خدا نے منع کیا ہے۔ پھر وہ بے شرمی کے کام نہ کرے گا۔ وہ خدا کو حاضر و ناظر جانے گا۔ پھر بے ایمانی، رشوت خوری، چور بازاری اور ملاوٹ وغیرہ سارے بُرے کاموں سے بچے گا۔

یہ جو رسمی نمازیں اور روزے ہیں یہ تو باپ دادا اور اپنے ماحول کے رسم و رواج کی پابندی میں ہیں۔ اگر خدا کو مانا ہوا ہوتا تو اس کے احکام کی نافرمانی کیوں کرتے؟ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ اخباروں میں خدا کو ماننے والوں کے اعمال کی فہرستیں شائع نہ ہوتی ہوں۔ ڈکیتی، نقب زنی، اغوا، چوری،

اسمگلنگ، ملاوٹ، چور بازاری، بددیانتی، رشوت ستانی، جعلسازی، فحاشی، قتل غرض یہ کہ کونسا جرم ہے جو خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے نہ کر رہے ہوں؟

مسلمانو! خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والو! خدا کے عذاب سے ڈرو۔ پچھلی اُمتوں کے حالات دیکھو۔ جب بنی اسرائیل خدا کو زبانی مانتے ہوئے اس کے احکام کی مسلسل نافرمانی کرتے رہے تو اس نے اپنے ایک نہایت ذلیل بندے بخت نصر کو ان پر مسلط کر دیا۔ اس نے لاکھوں کو قتل کیا، شہروں کو برباد کر دیا، بیت المقدس کو کوڑا گھر بنا دیا۔ اب جبکہ دنیا میں ہر طرف مسلمانوں پر تباہی آئی ہوئی ہے، اب بھی اگر خدا کو دل سے نہ مانو گے تو اس کے عذاب سے کہیں مفر نہ ہوگا۔

اب تو ہر وہ مسلمان جس کے دل میں تھوڑی بہت خدا کے نام کی محبت ہوگی، ضرور سوچے گا اور غور کرے گا کہ ہم بچپن سے سنتے رہے کہ خدا ہے اور ہر نادان جاہل بھی یہ جانتا ہے اور مانتا ہے کہ یہ آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بنے۔ ضرور ان کا کوئی بنانے والا ہے اور وہی خدا ہے۔ باوجود اس یقین کے پھر ہمیں خدا کے وجود کا ایسا یقین کیوں نہیں ہوتا جس سے اس کے احکام کی نافرمانی سے بچ سکیں، اور صحیح معنوں میں خدا کو مان لیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے خدا کی کتاب کو جو ہمارے ہاتھوں میں ہے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ یہود کے لئے جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ البقرہ	ان لوگوں کے ایک گروہ نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ گویا کہ وہ بالکل جانتے ہی نہیں۔

اسی طرح ہم مسلمانوں نے بھی خدا کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا ہے کہ اس کو سمجھنے کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں کرتے۔ اس کو بالکل ہی بھلائے ہوئے ہیں۔ اکثر مسلمان تو کہیں گے، ہم تو کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں، رمضان شریف میں تراویح پڑھتے ہیں۔ ہم نے خدا کی کتاب کو کہاں چھوڑا ہے؟

افسوس کہ جو الفاظ ہم اپنے منہ سے نکالتے ہیں، ان کے معنی و مفہوم بھی نہیں سمجھتے ہم کہتے ہیں،

ہم نے خدا کی کتاب کو نہیں چھوڑا ہے تو کیا ہم اس کو پکڑے ہوئے ہیں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا۔ ''قرآن سے تمسک کرو'' یعنی اس کو مضبوط پکڑے رہو اور مضبوط پکڑنے کے معنی کتا، بلی، چوہا اور ہر جانور بھی جانتا ہے کہ جس چیز کو مضبوط پکڑے لے گا اس کے ساتھ، اس کے پیچھے پیچھے چلے گا۔ پس اگر ہم قرآن کو پکڑے ہوئے ہیں تو اس کے احکام کے پیچھے کیوں نہیں چلتے اور جب نہیں چلتے تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ہم نے خدا کی کتاب کو چھوڑ رکھا ہے۔

جو لوگ اس بات کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم نے کتاب خدا کو چھوڑ رکھا ہے ان کو چاہئے کہ کتاب اللہ میں خدا کی شہادت ہی دیکھ لیں۔ جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي	اور رسول کہیں گے (یا رسول نے کہا) اے رَب
اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴿۳۰﴾	میری قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ دیا۔

الفرقان

اگر اس آیت کا لفظی ترجمہ کریں تو بالکل ہمارے مناسب حال ہوتا ہے (رسول نے کہا اے رب میرے تحقیق کہ میری قوم نے پکڑا اس قرآن کو بالکل چھوڑے ہوئے)۔ یعنی کاغذ کی جلد کو ہاتھوں سے پکڑے ہوئے اس کے احکام کو چھوڑ دیا کہ کسی حکم کی بھی تعمیل نہ کی۔ ایک تمثیل سے یہ امر بھی واضح ہو جائے گا کہ ہم قرآن کو کس طرح مانتے ہیں۔ مندرجہ ذیل تمثیل کو غور سے پڑھیں تو یہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

تمثیل

مشرقی ممالک میں سے کسی ملک کا ایک بڑا افسر سال ڈیڑھ سال کی ٹریننگ کے لئے امریکہ جاتا ہے تو اپنی کوٹھی کو خانساماں کی نگرانی میں دے دیتا ہے اور کسی ملازم کو برطرف نہیں کرتا، اور خانساماں کو حکم دیتا ہے کہ ہر مہینہ بیگم صاحبہ سے چیک لے کر سب ملازمین کو تنخواہیں دے دیا کرے اور اپنی تنخواہ بھی لے لیا کرے۔ واپسی سے چند ماہ قبل وہ خانساماں کو خط لکھتا ہے کہ ''ہمارا کام قریبِ ختم ہے۔ ہماری نئی کوٹھی جو فلاں ٹھیکیدار بنوا رہا تھا مکمل ہو چکی ہے۔ اب تم ٹھیکیدار سے کہنا کہ کوٹھی میں تمام فرنیچر مہیا

کر کے اس کو سجا دے۔ ہم اپریل کے پہلے ہفتہ میں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اور ۷/اپریل کو ہوائی جہاز سے وہاں پہنچیں گے۔ ہمارے ہمراہ تین مہمان بھی ہوں گے۔ ان کے کھانے کا بندوبست بھی کر لینا اور ڈرائیور کو حکم دینا کہ ۷/اپریل کو دس بجے دن کے ہوائی اڈہ پر کار لے کر پہنچ جائے۔ ان تمام کاموں کو یاد رکھنا، کسی طرح کی کوتاہی نہ ہو''۔

اب ۷/اپریل کو جب افسر صاحب ہوائی جہاز سے اترتے ہیں تو تلاش کرنے پر بھی ان کو اپنی کار کہیں نظر نہیں آتی۔ مجبوراً ٹیکسی لے کر نئی کوٹھی پر پہنچتے ہیں تو وہ خالی پڑی ملتی ہے پھر پرانی کوٹھی پر جاتے ہیں تو وہ مقفل نظر آتی ہے۔ ایک ملازم موجود ہے اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ خانساماں صاحب سینما دیکھنے گئے ہیں۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد خانساماں صاحب تشریف لاتے ہیں اور جلدی جلدی تالا کھول کر کوٹھی کے کمروں کے دروازے کھولتے ہیں۔

جب افسر صاحب اطمینان سے بیٹھتے ہیں تو خانساماں کو بلا کر پوچھتے ہیں:۔

''کیا ہمارا خط تمہیں نہیں ملا تھا؟''

وہ کہتا ہے ''حضور وہ تو مل گیا تھا''۔

افسر کہتا ہے ''کیا تم نے یہ نہ سمجھا کہ وہ ہمارا خط ہے؟''

خانساماں کہتا ہے:۔

''حضور بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں حضور کا خط نہ پہچانتا۔ میں نے تو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ حضور کا خط ہے۔ میں تو اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ دل سے مان لیا تھا۔ میں نے تو مالک کے خط کو مخمل میں لپیٹ کر معطر کر کے اونچی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ اس کا بڑا احترام کرتا رہا ہوں۔ خدا کی قسم روزانہ صبح کو پڑھ لیتا ہوں آنکھوں سے لگاتا ہوں۔ احتراماً اس کے بوسے لیتا ہوں۔ اتنی دفعہ پڑھا ہے کہ حِفظ بھی ہو گیا ہے۔ قسم لے لیجئے میں تو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں''۔

افسر کہتا ہے کہ:۔

’’پھراس سب کے باوجود تم نے وہ کام کیوں پورے نہ کئے جو اس میں ہم نے لکھے تھے‘‘۔

اب خانساماں جی! کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور وہ اسی وقت نکال دیئے جاتے ہیں۔

اب آپ نے دیکھ لیا کہ وہ خانساماں جی! افسر کے خط کو روزانہ پڑھتے، مخمل میں لپیٹ کر رکھتے، احتراماً اس کے بوسے لیتے مگر اس میں جو کام کرنے کو لکھا تھا اس کے نہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔

اسی طرح مالکِ کائنات کے خط کو جو ہماری طرف رسولؐ کے ذریعہ بھیجا گیا ہے مخمل میں لپیٹ کر اونچی جگہ رکھنے، اس کو بوسے دیتے رہنے۔ اس کو روزانہ پڑھتے رہنے سے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ جب تک اس کے احکام پر عمل نہ کریں۔ اگراس کے احکام سے روگردانی کرتے رہے تو اس خانساماں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مالک کی رحمت سے خارج کر دیئے جائیں گے اور عذاب دائمی اور ہلاکت ابدی میں مبتلا ہوں گے۔

بات یہ ہے کہ اس کے احکام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی خواہش تو اسی وقت ہوسکتی ہے جب خدا رسولؐ اور خدا کی کتاب کو دل سے مانا ہو۔ جب ہم نے صحیح معنوں میں ان کو مانا ہی نہیں تو احکام کی تعمیل کا خیال ہی کیوں آئے۔ اب بھی وقت ہے کہ آنکھیں کھولیں اور خدا کی کتاب کو دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارا رب تو فرماتا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ النساء

اے وہ لوگو (جو زبانی) ایمان لائے ہو۔ ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اُتاری اور اس کتاب پر جو پہلے نازل کی۔ پس جو روگردانی کئے رہا اللہ سے اور اس کے فرشتوں سے اور اس کی کتابوں سے اور اس کے رسولوں سے اور آخرت کے دن سے پس وہ راہ راست سے گمراہ ہوا اور اس سے بہت دور ہو گیا۔

افسوس ہمیں تو بچپن سے یہ سبق پڑھا دیا گیا تھا کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ پڑھ لیا اور ایمان حاصل ہو گیا۔ اب آنکھیں کھول کر دیکھو کہ رب فرماتا ہے۔ ''اے وہ لوگو! جنہوں نے آمنت باللہ پڑھ لیا ہے اور زبان سے کہہ لیا ہے۔

''میں ایمان لایا اللہ پر، اس کے رسول پر، اس کی کتاب پر۔ اس کے فرشتوں پر، اس کے انبیاء پر، اس کی پہلی کتابوں پر اور روز جزا پر اور خیر وشر کے اندازے پر کہ سب اللہ کی طرف سے ہے''۔

یہ سب جو زبان سے مانا ہے اس کو دل سے مان لو۔ دل سے بھی ایمان لے آؤ اور خدا کی کتاب پر عمل کرو۔ اگر احکام سے منہ پھرائے رہے تو سوائے جہنم کے کہیں ٹھکانہ نہ ہوگا۔

ہمارے علماء دین ہمیں آمنت باللہ تو پڑھا دیتے ہیں مگر ایمان کے معنی نہیں بتلاتے بتلاویں بھی کیوں جب کہ وہ خود ہی اس پر کبھی غور نہیں کرتے۔ ایمان کی تعریف زبانی تو یہ بتلاتے ہیں:۔

اَلْاِيْمَانُ هُوَ التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَ الْاِقْرَارُ بِاللِّسَانِ وَ الْعَمَلُ بِالْاَرْكَانِ۔

ایمان نام ہے دل سے تصدیق کرنے، زبان سے اقرار کرنے اور اعضاء و جوارح سے عمل کرنے کا۔

مگر افسوس خود ہی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر احکام خدا و رسول پر عمل نہیں ہے تو دل

سے تصدیق بھی نہیں کی ہے۔ پھر ایمان کہاں ہوا؟ صرف زبانی اقرار تو ایمان نہیں ہے۔ دیکھو رَبّ العزّت فرماتا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

البقرة

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، اس کی تلاوت کرتے ہیں جو حق ہے تلاوت کرنے کا۔بس وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس سے روگردانی کیئے رہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اکثر مسلمان اس آیت کو دیکھ کر کہہ دیں گے ہم تو ایک دو رکوع روز پڑھ لیتے ہیں۔تراویح بھی پڑھتے ہیں۔ پورا قرآن رمضان شریف میں سُن لیتے ہیں۔کیا یہ تلاوت نہیں ہے؟ افسوس! وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ تو محض تلاوت ہے۔اس سے تلاوت کا حق تو ادا نہیں ہوتا۔

اگر آپ کو کسی دوست یا عزیز کا خط ملے تو کیا اس کے پڑھ لینے کا حق یہی ہے کہ اس کو پڑھ کر جیب میں ڈال لیں اور جن کاموں کو اس نے لکھا ہے اور جن باتوں کا جواب مانگا ہے ان کے لئے کچھ بھی نہ کریں، کیا اس طرح اس کا حق تلاوت پورا یا ادا ہو جاتا ہے؟ خط کے پڑھنے کا حق تو اسی وقت ادا ہوگا جب آپ ان کاموں کو پورا کر دیں گے جو اس میں لکھے ہیں اور ان باتوں کا جواب لکھ دیں گے جو اس نے دریافت کی ہیں۔

یہ تو ایسی بات ہے کہ ایک احمق جاہل بھی اس کو سمجھ سکتا ہے۔اسی لئے رَبُّ العزت نے فرمایا ہے کہ جو اس کا حقِ تلاوت ادا کرتے ہیں یعنی سمجھ کر عمل بھی کرتے ہیں۔بس وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو حقِ تلاوت ادا نہیں کرتے یعنی عمل نہیں کرتے اور اس پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور نقصان اٹھانے والے ہیں یعنی آخرت میں عذابِ دائمی میں مبتلا رہیں گے۔اب بھی آپ سمجھے ہم نے رَب کے کلام کو عَبَث اور بے فائدہ شے سمجھ رکھا ہے۔

اب تو واضح ہو گیا کہ حقِ تلاوت کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ پڑھے تو سمجھے اور عمل کرے اگر ہم کلام

اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس پر عمل نہ کریں تو مستوجبِ عذابِ الٰہی ہوں گے۔ تراویح کا مقصد تو یہ ہے کہ قرآن لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہوجائے۔ اگر یہ رسم جاری نہ ہوتی تو آج ایک بھی حافظِ قرآن موجود نہ ہوتا۔ تمام ادیانِ عالم میں دیکھ لیں کہ ان میں ان کی مذہبی کتابوں کا ایک حافظ بھی موجود نہیں۔

یہ نمازِ تراویح ہی کی برکت ہے کہ قرآن لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور بے شمار حافظ موجود ہیں مگر تراویح سے حقِ تلاوت تو ادا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ لوگ جو اس کے احکام پر عمل نہیں کرتے مَنۡ یَّكۡفُرۡ بِهٖ کے مصداق ہوتے ہیں۔ کفر کے معنی ہیں ''انکار کرنا، روگردانی کرنا یعنی توجہ نہ کرنا، حکم کی تعمیل نہ کرنا۔ پس قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے، اُس کو خدا کا حکم جانتے ہوئے اگر حکم نہ مانیں تو تلاوت نہ کرنے والوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ عذاب کے مستوجب ہوں گے۔

ہمیں تو بچپن سے یہ سبق پڑھا دیا گیا کہ قرآن کا سُننا واجب اور پڑھنا سُنت ہے۔ اِس سے بڑا ثواب ملتا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ اِس سے ثواب ملتا ہے مگر کس کو؟ اللہ پاک تو فرماتا ہے:۔

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲۷﴾ المائدہ — اللہ تو بس متقین ہی سے قبول کرتا ہے۔

پس جو لوگ قرآن کو اس نیت سے پڑھتے ہیں کہ اس کے احکام کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں اُن ہی کو یہ ثواب ملتا ہے کہ اُن کے دلوں میں احکامِ باری تعالیٰ پر عمل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو رَب کی نصرت و توفیق طلب کرتے ہیں۔ پس اُن کو رَب کی طرف سے عمل کرنے کی قوت اور اُس کی تائید و توفیق عطا فرمائی جاتی ہے اور جن کو یہ خواہش نہیں ہوتی وہ مستوجب عذاب ہوتے ہیں۔

اِس پر بعض حضرات حیران ہوں گے کہ یہ کیا نئی بات سُن رہے ہیں کہ کوئی شخص قرآن کی تلاوت کرنے سے مستوجب عذاب ہوجائے۔ اِس کے لئے قرآن ہی میں دیکھیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَیَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ یونس — اور اللہ تعالیٰ نجاست ڈال دیتا ہے ان لوگوں پر جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

اب غور کریں کہ جن پر خدا نجاست ڈال دے وہ تو اس کی رحمت سے دُور اُس کے عذاب، اُس کی لعنت میں گرفتار رہتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عقل سے کام لے کر سمجھیں کہ قرآن کو خدا کا کلام مان

کر عمل نہ کرنے والا زیادہ عذاب کا مستوجب ہے یا نہ ماننے والا؟ اس کی تلاوت کر کے عمل نہ کرنے والا زیادہ مجرم ہے یا تلاوت نہ کرنے والا؟ اس کے لئے صرف ایک تمثیل ہی دیکھ لیں۔

تمثیل

ایک سڑک فوجی رقبہ کے اندر سے گزرتی ہے۔ اس کے سِرے پر ایک بڑا سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔ ایک روز بورڈ پر اشتہار لگایا گیا کہ:۔

''شام کو چھ بجے کے بعد اس سڑک سے گزرنے کی ممانعت ہے۔ خلاف ورزی کرنے والا گرفتار کرلیا جائے گا اور سزا پائے گا''۔ بحکم افسر کمانڈنگ۔

دوسرے دن تین آدمی گرفتار شدہ افسر کمانڈنگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ:۔

''حضور میں تو پڑھا لکھا نہیں۔ مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس سڑک سے گزرنے کی ممانعت ہے۔ قصور ہوا معاف کیا جائے''۔

اس کو کچھ جرمانہ کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔ دوسرا کہتا ہے:۔

''حضور میں نے بورڈ پر اشتہار دیکھا تو تھا مگر اس پر نہ تو دفتر کی مہر تھی، نہ کوئی ایسا نشان تھا جس سے یقین ہو جاتا کہ یہ سرکاری حکم ہے۔ بیشک قصوروار ہوں۔ اس دفعہ معاف کر دیا جائے، آئندہ کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی''۔

اس کو پہلے کی نسبت زیادہ سزا ملے گی۔ اب تیسرا کہتا ہے کہ:۔

''حضور میں نے اشتہار پڑھا تھا۔ میں تو اس پر ایمان لے آیا تھا کہ یہ سرکار کا حکم ہے۔ سزا تو ان لوگوں کو ملنی چاہئے جنہوں نے اس کو سرکاری حکم نہ جانا۔ میں تو اس پر ایمان لایا ہوں کہ بے شک یہ سرکاری حکم ہے''۔

اب صاحبانِ عقل بتلائیں ان میں سب سے زیادہ سزا کس کو ملے گی اور کس کو انصافاً ملنی چاہئے؟ اُس کو جو اِس کو سرکاری حکم جانتا ہے یا اُن کو جو اِس کو سرکاری حکم نہیں جانتے؟

اس تمثیل سے ظاہر ہو گیا کہ خدا اور رسول کو ماننے والے قرآن کو خدا کا کلام جاننے والے اگر اس کے احکام کی تعمیل نہ کریں تو نہ ماننے والوں کی نسبت زیادہ عذاب کے مستوجب ہوں گے۔

ایمان لانے کا زبانی دعویٰ کر کے عمل نہ کرنے والوں کو قرآن منافق قرار دیتا ہے اور منافقوں کے لئے ارشاد ہے:۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۝١٤٥ النساء — تحقیق کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

اور یہ بات عقل کے عین مطابق ہے۔ کفار و مشرکین پر اتنا شدید عذاب نہ ہوگا جتنا مان کر نہ ماننے والے منافقوں پر ہوگا۔

اب یہ بھی دیکھ لیں اور عقل سے کام لے کر سمجھیں کر تلاوت کر کے عمل نہ کرنے والا زیادہ مستوجب عذاب ہے یا تلاوت نہ کرنے والا؟ دیکھیں اور عقل سے کام لے کر سمجھیں۔ جو شخص یہ آیت پڑھے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ۝٣٨ المائدہ — چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔

اور پھر چوری کرتا رہے تو جتنی مرتبہ اس آیت کو پڑھے گا اتنا ہی زیادہ عذاب کا مستوجب ہوگا۔ یا جو شخص اس آیت کو پڑھے:۔

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۝١٨٨ البقرہ — آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

اور رشوت ستانی، چور بازاری، فریب دہی، ملاوٹ، بد دیانتی وغیرہ میں مصروف رہے تو وہ جتنی مرتبہ اس آیت کی تلاوت کرے گا، اتنا ہی زیادہ مستوجبِ عذابِ الٰہی ہوگا۔ تلاوت کا ثواب تو اُسی کے لئے ہے جو مالک کے حکم پر، جس کو وہ پڑھے تو عمل کرے۔ یا کم از کم اتنا تو ہو کہ اُس کے دل میں مالک کے حکم پر عمل کرنے کی خواہش ہی پیدا ہو اور مالک سے توفیق و نصرت و تائید کا طالب ہو جائے کہ ربّا!

مجھے اپنے احکام پر عمل کرنے کی قوت عطا فرما۔

مشکل تو یہ ہے کہ ہم الفاظ کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے۔ جب ہم ان الفاظ کے معنی بھی نہیں سمجھتے جو روزانہ بولتے ہیں تو قرآن وحدیث کے الفاظ کا مفہوم کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ قرآن میں جا بجا آیا ہے:۔

فَهُمْ غٰفِلُوْن پس وہ غافل ہیں۔

اولٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْن وہی تو وہ ہیں جو غافل ہیں۔

کہیں ان کروڑوں مسلمانوں میں کتنے ایسے ہیں جو ''غافلون'' کے معنی سمجھتے ہیں ہزاروں میں مشکل سے ایک نکلے گا اور نا معلوم اتنے بھی ہوں یا نہ ہوں، اور سورۂ تکاثر میں ہے:۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② التکاثر — تم کو تو ہوس ہی نے غفلت میں رکھا ہے یہاں تک کہ تم قبروں سے ملے۔

بتلایئے کیا آپ نے کبھی غفلت کے معنی سُنے ہیں؟ کیا کبھی یہ جاننے کی خواہش ہوئی ہے کہ ''غافلون'' کے کیا معنی ہیں؟ الھٰکم (تمہیں غفلت میں رکھا) سے کیا مطلب ہے؟ اور اس پر یہ دعویٰ کہ ہم تو کتابِ خدا سے تمسک کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے کتابِ خدا کو کہاں چھوڑا ہے۔ یہ دعویٰ اور خیال سوائے فریبِ نفس اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

اَلنَّاسُ نِيَامٌ اِذَا مَاتُوا انْتَبِهوا۔ (لوگ تو سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے)۔

یہ حدیث سورۂ تکاثر کی پہلی آیت کا جو اوپر نقل کی ہے گویا ترجمہ ہی ہے۔ جن کو ایمان لانے کا دعویٰ ہے اور خدا اور رسول اور قرآن کو ماننے کے مدعی ہیں، بتائیں کبھی ان کو اِس سویا ہوا ہونے کا مطلب جاننے کا خیال بھی آیا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ جب ہمیں الفاظ کے معنی ہی معلوم نہ ہوں تو خدا کے دین کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟

خیر اگر آج تک غفلت کے معنی نہیں سُنے تو اب سُن لیں۔ اگر ''لوگ سوئے ہوئے ہیں''۔ کا مطلب آج تک معلوم نہیں ہوا تو ابھی وقت ہے مرنے سے پہلے جان لینا ضروری ہے۔ اگر اَلْهٰكُمُ

التَّکَاثُرُ کے معنی آج تک معلوم نہیں ہوئے تو قبر سے مُلاقی ہونے سے پہلے معلوم کرلینا ضروری ہے۔ ورنہ اگر موت کے وقت معلوم ہوئے تو سوائے حسرت وندامت اور کچھ نصیب نہ ہوگا۔

دیکھو، سنو اور سمجھو، یہ جان جو ہمارے جسم میں ہے جس کے نکل جانے سے موت واقع ہوجاتی ہے یہی ہمارا نفس ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً دوسو جگہ لفظ ''نفس'' آیا ہے۔ دین کا تعلق نفس ہی سے ہے اور یہ غافل سویا ہوا ہے۔ اچھا ہم کیسے معلوم کریں کہ یہ ہوشیار ہے اور جاگ رہا ہے یا غافل اور سویا ہوا ہے۔ اس کے لئے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ کوئی بات یہ کیسے سمجھتا ہے۔

دیکھیں جب سے بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے حواسِ خمسہ کام کرنے لگتے ہیں، جو کچھ وہ دیکھتا ہے ہر پلک جھپکنے پر اس کی تصویر نفس پر بنتی ہے۔ جو سنتا ہے اس کی آواز کے، جو چکھتا ہے اس کے ذائقہ کے، سونگھنے سے خوشبو و بدبو کے، اور چھونے سے گرمی سردی سختی نرمی وغیرہ کے نقوش نفس پر بنتے رہتے ہیں۔

غرض یہ کہ ہر حالت یا کیفیت کا، ہر حس واحساس کا جس کا اِس کو تجربہ ہوتا جاتا ہے، اُن سب کا خزانہ نفس میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ جو چیز اِس نے دیکھی ہوئی ہو اُس کا اگر نام لیا جائے تو جیسے کوئی کہے ''ارے کالی بلی'' تو سننے والے کے ذہن میں کالی بلی کی تصویر ابھرے گی یا کوئی شخص پوچھے ''کل تم نے نمائش میں کیا دیکھا'' تو جس نے نمائش دیکھی ہوگی، اس کے ذہن میں سب کی تصویر آجائے گی۔ کسی پچھلے واقعہ کا خیال کریں تو پوری تصویر سامنے آجائے گی۔ اگر کوئی کہے ''کھٹا، کھٹا، کھٹا'' تو سننے والے کے منہ میں پانی آجائے گا۔

یہ کیا بات ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ نفسِ انسان جو لفظ سنتا ہے۔ اس کی تصویر یا کیفیت اپنے خزانوں میں سے نکال کر اس سے ملا کر سمجھتا ہے یعنی یہ۔ پس اگر کوئی کہے ''امیرت''، ''امیرت'' یا ''قنور، قنور'' تو سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ آواز کان کے پردے سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اس نے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں اور ان کی تصاویر اس کے خزانوں میں موجود ہی نہیں۔

اب سوچیں اور سمجھیں کہ ہر دم و ہر لحظہ ہمارا نفس یہ سب کچھ کرتا رہتا ہے مگر اس کو خود بھی اس کی خبر نہیں ہوتی کہ میں کچھ کر بھی رہا ہوں یا نہیں۔ یہ تو بالکل آٹو میٹک یعنی خود کار مشین کی طرح کام کرتا ہے جیسے کہ مشین کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اس طرح اس کو بھی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ یہ تو سارے کام اس طرح کرتا ہے۔ جیسے سوئے ہوئے آدمی کے تِنکا چبھوئیں تو اس کا ہاتھ سوتے میں وہیں آتا ہے حالانکہ اس کو خود اس کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔

یہ ہے اس کی غفلت و لاشعوری جس کا قرآن و حدیث میں جابجا ذکر کیا گیا ہے۔ اس غفلت کی حالت میں اسے سننے، دیکھنے، سونگھنے، چھونے یا خیال آنے سے جو خواہش بطورِ ردِ عمل پیدا ہوتی ہے وہ تِنکے کی طرح چبھتی ہے اور وہ فوراً اُس کی تسکین کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو سوچنے، سمجھنے اور عقل سے مشورہ کرنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔

یہ سوتے ہوئے بھی ہر دم و ہر لحظہ جسم اور اعضاء جسم پر حکم چلاتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس کو ''نفسِ امارہ'' (بہت حکم چلانے والا نفس) کہتے ہیں۔ آدمی بے سوچے سمجھے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے اور یہ منزلت تو سوائے معبودِ حقیقی اور کسی کے لئے نہیں کہ اس کے حکم کی بے سوچے سمجھے بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔

اسی لئے قرآنِ حکیم نے احکامِ نفس کی فوری تعمیل اور خواہشات و جذبات کی بے سوچے سمجھے تسکین کرنے کو شرک قرار دیا ہے۔ جیسا کہ جناب رب العزت عزاسمہ، کا ارشاد ہے:۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۟ۙ ﴿۴۳﴾ فرقان

(اے رسول) کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنے نفس کی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ پس تم اس کے کاموں کے درست کرنے والے کیسے ہو سکتے ہو۔

اِس آیہ وافی ہدایہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو بے سوچے سمجھے احکامِ نفس کی تعمیل کرتا رہے، اُس کو رسولؐ کی رسالت اور اسلام سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے اُمور میں دنیا و آخرت کی اصلاح نہیں

ہوسکتی۔ وہ تو شرک باطنی میں مبتلا ہے۔ یہی وہ نجاست ہے جس سے نفوسِ خلق کو پاک کرنے کے لئے خدا نے اپنے محبوب کو رسول بنا کر بھیجا۔

پس جو شخص بندگیِ نفس میں مبتلا رہے اور بے سوچے سمجھے نفس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا رہے اُس کا نفس ہی اُس کا معبود اور اُس کا الٰہ ہے۔ اُس نے تو صِدقِ دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا ہی نہیں۔ محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دینا کافی نہیں۔ زبان سے تو بُت پرست بھی کہہ دیتا ہے مگر لا الٰہ صحیح طور پر کہنا تو اُسی وقت ہوگا جب بتوں کی پرستش ترک کردے۔ مگر ہم ہزاروں خواہشوں کے بت پوجتے ہوئے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم نے تو لا الٰہ الا اللہ دل سے کہہ لیا ہے ہم تو شرک سے نکل گئے ہیں۔ ہم تو خدائے واحد پر ایمان لے آئے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ تو فرما گئے ہیں:۔

اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

اب یہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہمارا نفس بالکل غافل سویا ہوا ہے پھر سوئے ہوئے ہونے کی حالت میں خدا کو مان لینا، رسول کو مان لینا، جنت، دوزخ، قیامت اور فرشتوں پر ایمان لے آنا کس کام کا ہے۔ اس کے باطن پر تو کچھ اثر ہوتا ہی نہیں۔ جب یہ جاگے گا تو کچھ بھی مانا ہوا نہ ہوگا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ بندوں کے نفوس کو غفلت کی اس نجاست سے پاک کیا جائے۔ اگر تھوڑی بہت بھی غفلت کم ہوجائے تو انسان بندگیِ نفس سے بچ سکے گا۔ تب ہی شرکِ باطنی کی نجاست دور ہوسکے گی اور اُسی وقت لا الٰہ الا اللہ اُس کے دل میں اترے گا۔ تو خدا کو ایسا مان سکے گا جو اس کے ماننے کا حق ہے۔

حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے)۔

ہماری زندگانی دنیا کے اعمال کا نتیجہ ہی آخرت میں ملے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس غفلت نفس سے جس کی وجہ سے ہم دل سے اور عملی طور سے لا الٰہ نہیں کہہ سکتے۔ اس مادی دنیا

میں ہمیں کتنے نقصانات پہنچتے ہیں۔

① قدرت نے ہمیں سونگھنے اور چکھنے کی قدرت اس لئے دی ہے کہ ہم مضر اشیاء کے استعمال سے بچے رہیں۔ جنگلی جانور جو آزاد فضا میں رہتے ہیں، ان کی سونگھنے اور چکھنے کی قوت ان کو ہر مضر شے کھانے سے بچاتی ہے۔ اسی لئے وہ بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر نفسِ انسان کی غفلت کم ہو جائے تو یہ بھی مضر اشیاء کھانے سے محفوظ رہے گا۔ جس سے اس کی صحت قائم رہے گی۔

② غفلت کے باعث اس کو صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ کس قدر غذا کامل طور پر ہضم کر سکے گا۔ ذائقہ کی لذت اس پر غالب آجاتی ہے اور ضرورت سے زائد کھالیتا ہے جو ہضم تام نہیں ہوتا اور یہ صحت کی خرابی کا باعث ہوتا ہے۔

③ قانون قدرت ہے کہ جتنی غذا کامل طور پر ہضم ہو جاتی ہے وہ تو جزوِ جسم ہو جاتی ہے اور فضلات اور غیر منہضم غذا پیشاب، پاخانہ اور پسینہ سے خارج ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی غفلت کے باعث ایسی تمام غذا خارج نہیں ہوتی۔ اگر یہ غافل نہ ہو تو تمام ان اجزاء کو جو جزوِ جسم نہیں بن سکتے، خارج کر دے مگر غفلت کے سبب وہ تمام خارج نہیں کر سکتا اور ان ہی کو مادہ فاسدہ کہتے ہیں۔ بس یہ فاسد مادہ جسم کے کمزور حصوں میں جمع ہوتا رہتا ہے اور نتیجہ میں مہلک امراض کا باعث ہوتا ہے۔

④ اکثر امراض کی حالت میں جسم میں جس چیز کی کمی باعث مرض ہوتی ہے اگر اس کو پورا کر دیا جائے تو مرض دفع ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی غفلت کم ہو جائے تو اس کو ایسی چیزوں کی طرف سخت رغبت ہو گی جن کے کھانے سے مرض دفع ہو جائے مگر غفلت کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔

⑤ نفسِ انسان کو جس چیز یا کام کی عادت پڑ جائے پھر اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ جب یہ افیون چانڈو چرس وغیرہ یا کسی اور نشہ کا عادی ہو جاتا ہے تو صحت بھی خراب ہوتی ہے اور مالی

بھی اس مرض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ اگر نفس کی غفلت کم ہو جائے تو حالت مرض میں صحبت سے پرہیز کرے گا اور بیمار بچہ کی وجہ سے آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں سے محفوظ رہے گا۔

⑩ افیون، چانڈو، سمیات ومسکات وغیرہ کا زیادہ استعمال کرنے والوں کی اولاد میں دو ایک افراد ضرور امراضِ دماغی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس وقت تقدیر کا رونا روتے ہیں۔ اگر غفلت کم ہو جائے تو ایسی غلطیاں نہ ہوں گی۔

⑪ بہت سے امراض کی علامات بہت پہلے سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اگر اسی وقت روک کی جائے تو مرض کے حملے سے محفوظ رہ سکتا ہے مگر غفلت کے سبب نفس کو اپنی حالت کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ پس اگر غفلت کم ہو جائے تو ایسے امراض سے اپنی حفاظت کر سکے گا۔

⑫ غفلت کی حالت میں اس کے جذبات میں ایسا جوش ہوتا ہے کہ عقل سے کام نہیں لے سکتا۔ جوشِ جذبات میں بے شمار کام ایسے کر جاتا ہے جن سے سخت نقصانات ہوتے ہیں اور بعد کو حسرت وندامت میں تڑپتا ہے۔ عقلِ فطری یا ضمیر ایک قوتِ نورانی اس کے ساتھ ہے، اگر اس سے مشورہ کر کے کام کرے تو دنیا کے کاموں میں اسے کوئی نقصان اٹھانا نہ پڑے۔ مگر غفلت کی وجہ سے یہ تو صرف اپنی خواہشات وجذبات کی تسکین چاہتا ہے۔ عقلِ فطری یا ضمیر کی طرف توجہ کرنے ہی نہیں دیتا۔ اگر ضمیر کی آواز آتی بھی ہے تو اس کا سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ سے اس مادی دنیا میں بھی بے شمار جانی اور مالی نقصانات ہوتے ہیں۔ اگر نفس کی غفلت کم ہو جائے تو کاروبارِ دنیاوی اور اس زندگی میں بے شمار نقصانات سے محفوظ رہ سکے۔

⑬ قدرت نے اِس میں بے شمار باطنی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں مگر غفلت کے سبب اِن کے استعمال وفوائد سے محروم رہتا ہے۔ آج کل حرکتِ قلب بند ہونے سے بہت اموات ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ترغیبِ نفسی (Auto Sugession) ہی سے کام لیتا رہے تو ایسی اموات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

یہ اور ان ہی کی مثل بہت سے نقصانات تو وہ ہیں جو غفلتِ نفس کے باعث اس دنیا کی زندگی

میں ہوتے رہتے ہیں مگر سب سے بڑا نقصان، خسرانِ اخروی اور عذابِ دائمی ہے۔ اگر موت سے زندگی ختم ہو جاتی اور اس کے بعد دوسری زندگی نہ ہوتی تو کچھ زیادہ خوف نہ ہوتا مگر موت سے تو زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ موت تو دوسری زندگی کا دروازہ ہے جس کے لئے موت بھی نہیں اور ہمیشہ ہمیشہ اپنے اعمال کی سزا یا جزا پاتے رہیں گے۔

نفس کی غفلت سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہم صحیح معنوں میں خدا کو مان نہیں سکتے اور اس کے وجود کا یقینِ قلبی حاصل نہیں ہوتا اور شرکِ باطنی میں مبتلا رہتے ہیں اور جنابِ ربُّ العزت عزاسمہٗ ارشاد فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ النساء

بے شک اللہ تعالیٰ اس کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

اکثر حضرات تو حیران ہو جائیں گے کہ ہم تو بچپن سے ایک خدا کو مانتے ہیں پھر ہم سے اور شرک سے کیا واسطہ؟ اچھا لیجئے جس خدائے واحد کو آپ مانے ہوئے ہیں۔ اسی کی ذات اقدس پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیجئے۔ اگر وہ ہم کو مومن کہے تو مومن ہیں اور اگر مشرک بتلائے تو یقینا مشرک ہیں۔ اگر ہم خدا کو مانتے ہیں تو اس کے کلام کو بھی سچا ماننا پڑے گا۔ دیکھیں وہ تو فرما رہا ہے:۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ عنکبوت

جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو دل سے مانتے ہوئے پکارتے ہیں۔ پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی پر لے آتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔

اب دیکھ لیں کہ یہ ان ہی لوگوں کا ذکر ہے جو خدا کو واحد مانتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم تو مشرک نہیں ہیں۔

ماننے کی کتنی ہی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے، آیا وہ خدا

نقصان بھی ہوتا ہے۔ ان نقصانات کو جانتے ہوئے عادت ترک نہیں کرسکتا۔ اگر اس کی غفلت کم ہوجائے تو اس کو قابو حاصل ہوجائے گا۔

⑥ امراضِ وبائی کے جراثیم جسم میں داخل ہوکر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کو خبر نہیں ہوتی۔ اگر اس کی غفلت کم ہوجائے تو ان کو داخل ہی نہ ہونے دے اور جو داخل ہو بھی جائیں، ان کو ہلاک کردے۔ مگر اس کی غفلت کے باعث وہ ایک، ایک سے ہزار در ہزار ہوجاتے ہیں۔ جب کثرت ہوجاتی ہے تو مرض مہلک ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس کی غفلت کا نتیجہ ہے۔

⑦ نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ جہاں جسم میں تکلیف ہوتی ہے وہاں خون کو دوڑا دیتا ہے۔ جب سانپ بچھو یا کوئی زہریلا کیڑا کاٹتا ہے تو وہاں خون جمع کردیتا ہے۔ اس میں زہر کا اثر ہوجاتا ہے تو وہ خون لوٹ کر جسم میں جاتا ہے اور زہر کا اثر تمام جسم میں پھیل جاتا ہے۔ اگر اس کی غفلت کم ہوجائے تو خون کو خارج کردے جس سے زہر بھی نکل جائے۔ مگر اس کی غفلت کے سبب انسان ہلاک ہوجاتا ہے۔

⑧ تمام کائنات کا نظام نظر نہ آنے والی نوری شعاعوں پر قائم ہے۔ جس طرح سورج چاند کی شعاعیں ہمارے جسم ہمارے خواہشات و جذبات پر اثرانداز ہوتی ہیں، اسی طرح تمام ستاروں، سیاروں اور دوسرے نظام کوکبی اور کہکشاؤں اور نظر نہ آنے والے جہانوں سے جو شعاعیں آرہی ہیں وہ ہمارے نفس پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ ان میں بہت سی شعاعیں بعض لوگوں کے لئے مضر اور مہلک اثر کرنے والی ہوتی ہیں، وہ نفس پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ جب وہ مہلک اثرات اس کے تحت لاشعور میں جمع ہوجاتے ہیں تو ایکسیڈنٹ سے، پانی میں غرق ہونے سے۔ آگ میں جل جانے سے، طوفان یا سائیکلون میں گرجانے سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ اگر اس کی غفلت کم ہوجائے تو ایسی اموات سے محفوظ رہے گا۔

⑨ عام مشاہدہ ہے اگر کسی خاندان کا مورث کسی مرضِ مزمن میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی نسل میں اکثر افراد اسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مرض کی حالت میں جو حمل قرار پاتا ہے، اس بچہ میں

ہوجاتا ہے اور صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ صرف آخرت کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ ہمارا مالک تو دنیا کی زندگی میں بھی مسلم وغیر مسلم کے درمیان کھلا فرق دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ تو ارشاد فرما رہا ہے۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ۟ الجاثیہ	کیا گمان کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کمائیں کہ ہم ان کو ان کی مثل قرار دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل بجا لائے۔ ان کی زندگی اور موت کیا ایک جیسی ہوسکتی ہے۔ یہ لوگ کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں۔

اس آیت سے تو صاف واضح ہوجاتا ہے کہ خدا کے ماننے والوں کی دنیاوی زندگی اور ان کی موت غیر اللہ کے ماننے والوں یا خدا کو نہ ماننے والوں کی مثل نہیں ہوسکتی۔ ان کی دنیا کی زندگی میں بھی فرق ہونا ضروری ہے۔

اب خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے بتلائیں کہ ککڑ شاہ اور کٹا کٹ جی کے ماننے والوں اور خدا ورسولؐ کے ماننے والوں کی زندگانی دنیا اور ان کی موت کے درمیان کیا فرق ہے اور اگر کوئی فرق نہیں ہے تو خدا اور رسولؐ کو مان لینے کا دعویٰ سوائے فریبِ نفس کے اور کچھ نہیں۔ اس نفسِ امارہ کا سب سے بڑا عیب خود فریبی ہی ہے کہ یہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں بھی فریب میں مبتلا ہے اور یہی سمجھتا اور کہتا رہتا ہے، میں نے تو خدا کو رسوؐل کو مانا ہوا ہے۔

اس رسالہ کے ناظرین میں سے ہر صاحبِ فہم کو لازم ہے کہ خود اپنے نفس سے سوال کرے کہ اگر تو نے خدا کو مانا ہوا ہے تو بتلا کہ تیری زندگی اور خدا کو نہ ماننے والوں اور مشرکین کی زندگی میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟

ایک کافر و مشرک بھی اپنی خواہشات وجذبات کی تسکین بے سوچے سمجھے کرتا ہے اور تو بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ بھی اس دنیا کی زندگی میں ظاہری عزت وشہرت اور نام ونمود حاصل کرنا چاہتا ہے اور تو بھی یہی چاہتا ہے۔ وہ بھی ہر جائز وناجائز طریقہ سے مال و دولت حاصل کرنا چاہتا ہے اور تو بھی اُسی کی مثل

کو ماننے کے اصلی معنی میں مانتا ہے یا یہ ماننا فریب نفس ہی ہے؟ ایک مثال سے بالکل واضح ہو جائے گا کہ ہم خدا کو کیسا مانتے ہیں۔

مثال

ایک گاؤں میں اگر بچے ایسی فضا میں تربیت پائیں جہاں وہ سنتے رہیں کہ ککڑ شاہ دنیا کے پیدا کرنے والے ہیں جو آسمان پر رہتے ہیں اور کٹا کٹ جی ان کے اوتار تھے جنہوں نے ہمارے لئے بڑی مصیبتیں جھیلیں، ہمیں کھانے پینے کا سب سامان کٹا کٹ جی کے طفیل سے ملتا ہے۔ ککڑ شاہ آسمان سے پانی برساتے ہیں، زمین سے غلہ اور پھل اگاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اوتار کٹا کٹ جی کے ذریعہ سے خبر دی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر ناچتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں تو کھیتوں میں اور باغوں میں برکت دیتے ہیں۔

اب غور کریں جب یہ بچے جوان ہوں گے تو ان کو ککڑ شاہ اور کٹا کٹ جی کے ناموں سے کتنی محبت ہو گی اور وہ کتنے جوش کے ساتھ ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر ناچیں گے اور یہ ناچ ان کو کتنا مرغوب ہو گا۔

اب غور کر کے بتائیں کہ ان لوگوں کے ککڑ شاہ اور کٹا کٹ جی کو ماننے اور مسلمانوں کے خدا و رسولؐ کو ماننے میں کیا فرق ہے؟ سوچو اور سمجھو، حق و باطل ایک جیسے نہیں ہو سکتے خدا کے ماننے والوں اور ککڑ شاہ کے ماننے والوں میں کھلا ہوا فرق ہونا لازم ہے۔ ہم جس خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کا ہی فیصلہ دیکھ لیں۔ وہ تو فرماتا ہے۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٦﴾ القلم

کیا ہم مسلمین (احکام کی اطاعت کرنے والوں) کو مجرموں کی مثل قرار دیں گے۔ تم کو کیا ہو گیا ہے، کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ آخرت کا ذکر ہے کہ وہاں مسلم و مجرم ایک جیسے نہ ہوں گے۔ یہ تو موت کے بعد دوسری زندگی کا ذکر ہے۔ اگر خدائے قدوس کے کلام اقدس پر نظر کریں تو یہ وسوسہ بھی باطل

ہے۔ وہ بھی موت سے ڈرتا ہے اور اُس کی کبھی آرزو نہیں کرتا اور تو بھی ایسا ہی ہے۔ وہ بھی دنیا سے طول طویل امیدیں لگائے ہوئے ہے اور تو بھی اُسی کی طرح ہے۔ اُس کو بھی مال و اسباب دنیا میں نقصان ہونے سے اضطرار ہوتا ہے اِسی طرح تجھ کو بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہے کہ اپنے کو اِس قابل بنالوں کہ اپنی ہر خواہش کو پورا کرسکوں، جس کے لئے خوب مال و دولت جمع کرلوں اور تو بھی زندگی کا مقصد یہی سمجھتا ہے۔ وہ بھی اپنے پنڈتوں، احبار (عالموں)، سادھوؤں، پجاریوں اور پیروں فقیروں کے اقوال کو بے دلیل حق سمجھتا ہے اور تو بھی اپنے مولویوں، پیروں فقیروں کے اقوال کو بغیر کسی دلیلِ محکم کے خدا کا فرمان جانتا ہے۔ پھر بتلا تجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے؟

خدا پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے والوں کو چاہئے کہ ربّ العزت کے کلام پر نظر کریں۔ وہ تو فرماتا ہے:۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ﴿۲۱۲﴾ البقرۃ

یہ ذلیل و پست دنیا کی زندگی کافروں کی نظر میں زینت دی گئی۔

یعنی اس ذلیل دنیا کی زندگی کی زینت ان ہی لوگوں کی نظر میں ہوگی جو عالم الغیب سے روگرداں ہیں اور آخرت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نیز دوسرے مقام پر ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ (البقرہ)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ و ستارہ پرست (لامذہب) جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے۔ پس ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔ پس ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دیکھ لیں کہ زبانی ایمان لانے کا دعویٰ کرنے والوں کو خدا نے یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرست، لامذہبوں کی صف میں ان کے برابر لاکر کھڑا کردیا اور فرمادیا کہ ان میں سے جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لے آئے گا یعنی دل سے اس کے وجود کا یقین حاصل کرلے، اُسی کے لئے امن ہے۔ وہی عذاب

سے چھٹکارا پانے والا ہے۔ جب تک خدا کے وجود کا یقین قلبی حاصل نہیں ہوتا۔ اُس کا تقرب حاصل کرنے کی دل میں طلب بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ دنیا اور مالِ دنیا ہی کا طالب رہتا ہے جیسا کہ جناب ربُّ العزت کا ارشاد ہوا:۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۷۹﴾ قصص

جو لوگ دنیا کی زندگی کے طالب تھے انہوں نے کہا۔ اے کاش! ہمیں بھی وہ (مال و دولت) مل جاتا جو قارون کو ملا۔

پس جس کو خدا کی طلب ہوگی وہ دنیا کا طالب کیوں ہوگا۔ خدا نے تو ہمیں یہ سبق پڑھا کر اور سکھا کر پیدا کیا ہے کہ سب سے اچھی شے طلب کرو۔

بچہ کو دیکھیں کہ وہ کوئی کھلونا یا کوئی چیز پسند کر کے لیتا ہے تو اس کو اپنے سے علیحدہ نہیں ہونے دیتا، مگر جب اس سے زیادہ خوشنما یا چمکدار شے نظر آ جاتی ہے تو پہلی کو پھینک کر زیادہ خوشنما کے لینے کو دوڑتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ خالق نے یہ فطرت ودیعت کی ہوئی ہے کہ سب سے اچھی شے کی طلب کرے۔

اب ''دنیا'' کے معنی سمجھیں ادنیٰ، پست، ذلیل، کمینہ اور ''ادنیٰ'' کے معنی ہیں سب سے زیادہ پست، سب سے زیادہ ذلیل، سب سے زیادہ کمینہ اور ''دنیا'' ادنیٰ کا مؤنث ہے تو حیٰوۃ دنیا کے معنی ہوتے ہیں، سب سے زیادہ پست یا کمینی زندگی۔

اگر وجودِ باری تعالیٰ کا یقینِ قلبی حاصل ہو جائے اور دل سے خدا کو مان لے تو سب سے اچھی چیز تو اُس کی رحمت اور اُس کا قُرب ہی ہے۔ اُسی کی طلب دل میں پیدا ہو جائے گی پھر اِس کمینی زندگی پر کیوں جان دے گا۔ افسوس زبان سے تو ہم اُسی کی طلب کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر کی نیت کرتے وقت کہتے ہیں قربتاً الی اللہ (اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے) مگر سمجھتے نہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

ممکن ہے بعض حضرات کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ یہ تو رہبانیت کی تعلیم معلوم ہوتی ہے

اور اسلام میں ترکِ دنیا نہیں۔حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:۔

لَا رَهْبَانِيَةَ فِي الْإِسْلَامِ (اسلام میں ترک دنیا نہیں ہے)۔

اور دنیا کی طلب نہ کرنا رہبانیت ہے تو یہ وسوسہ اُسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب حقیقت سے واقف نہ ہوں۔ یہ ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں ہے بلکہ دنیا کو دین بنانے کی تعلیم ہے۔صرف ایک تمثیل ملاحظہ فرمالیں اور یہ امر بالکل واضح ہوجائے گا۔

تمثیل

تین کاشتکار اپنے کھیتوں پر دن رات سخت محنت کررہے ہیں۔تینوں سے ان کے شدید محنت کرنے کا باعث دریافت کیا۔ایک کہنے لگا۔ ''فصل پر لڑکے کی شادی کرنی ہے، چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا ہوسکے''۔ دوسرا کہتا ہے۔''ملک میں غلہ باہر سے منگانا پڑتا ہے، ہم کاشتکاروں کو ملک کی خدمت کرنی چاہئے ،تاکہ زیادہ سے زیادہ غلہ اگائیں اور ہمارا ملک خود کفیل ہوجائے''۔تیسرا کہتا ہے۔ ''خلق اللہ کے لئے زیادہ سے زیادہ غلہ اگانے کی کوشش کرنی لازم ہے تاکہ بندگان خدا کے لئے رزق مہیا ہوسکے''۔

اب دیکھ لیجئے۔ پہلا اپنے نفس کی بندگی کررہا ہے۔ دوسرا ملک کی خدمت اور تیسرے کا کام رَب کی عبادتِ حقیقی ہے۔کام سب کے ایک ہی جیسے ہیں صرف نیت کے فرق سے وہی کام شرک اور وہی کام عبادتِ حقیقی ہوجاتا ہے۔حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ نے اس امر کو اپنے ایک شعر میں واضح کردیا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن!
نے قماش ونقرۂ وفرزند و زن

کہ آدمی خدا کو بھول جائے ،اس کی یاد سے غافل ہوجائے سونا، چاندی، مال واسباب بچے، بیویاں یہ سب کچھ دنیا نہیں ہیں۔

ظاہراً تو خدا کو دل سے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی زندگی کے درمیان ظاہر بین نگاہوں کو کوئی فرق نظر نہ آئے گا حالانکہ دونوں کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔ کافر دنیا کے مال و دولت، ملک واملاک، اولاد و اسباب وغیرہ کو اپنی مِلک سمجھتا ہے۔ ان کو ''میری'' کہتے اور جانتے ہوئے ان کی محبت میں غرق ہوتا ہے جبکہ خدا کو دل سے ماننے والا۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ⑥ ط — جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین ہے سب اللہ کا ہے۔

پر ایمان لاتا ہے۔ وہ ہر شے کو خدا کی ملک جانتا ہے اور ان کی نگرانی اور خدمت خدا کے لئے کرتا ہے کہ یہ سب میرے رب کی مِلک ہیں اور ڈرتا رہتا ہے کہ کسی کام میں سُستی یا کوتاہی نہ ہوجائے، جس سے سزا کا مستوجب ہوجاؤں گا۔ وہ دنیا کی نعمتیں ملنے پر اِترائے گا نہیں اور جب اس کے اختیار و قابو سے باہر کوئی شے ضائع ہوجائے گی تو اس کا غم نہ کرے گا۔ وہ تو ہر حال میں مالک کا شکر ہی ادا کرتا رہے گا۔ اس کا تو ایمان مالک کے اس فرمان پر ہوگا۔

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۨ ㉓ حدید

تم کو افسوس بھی نہ ہو اُس پر جو تم سے ضائع ہوجائے اور نہ اتراؤ اُس پر جو وہ (مالک) نعمت تم کو عطا فرمائے۔ اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

جو خدا کے وجود کا یقین قلبی حاصل کرلے گا، اس کو معبود مان لے گا وہ تو اس کا عبد بن جائے گا۔ وہ تو صرف اُسی کی غلامی کرے گا۔ اُسی کا حکم بردار ہوجائے گا۔ خدا کو معبود مان لینے کا دعویٰ کرنے والوں کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی غلامی اختیار کرتا ہے مثلاً پولیس یا فوج میں بھرتی ہوتا ہے تو عہد نامہ پر دستخط کرنے کے بعد بندگی میں داخل ہوتے ہی حکومت کی شان و شوکت، عزت و وقعت میں سے اس کو تھوڑا بہت حصہ ضرور مل جاتا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں وہ کچھ نہ کچھ وقعت حاصل کرلیتا ہے۔

ہم میں سے جو خدا کی بندگی میں داخل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ

اس عظمت و جلال کی شہنشاہی میں سے ہمیں کیا حصہ ملا؟ کیا ہم غیر اللہ کی بندگی سے آزاد ہو گئے؟ کیا ہمارے کام اس کے لئے ہونے لگے؟ افسوس ہم تو نفس و شیطان کی بندگی میں گرفتار ہیں۔ رَب تو فرماتا ہے:۔

السجدۃ اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَیۡكُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۶۰﴾ یٰسین

اے بنی آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہ لیا تھا کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرنا۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾ (یٰسین)

اور یہ کہ صرف میری ہی بندگی کرنا یہی سیدھا راستہ ہے۔

مگر افسوس ہم تو نفس و شیطان کی بندگی میں مصروف ہیں۔ ہمارے سارے کام خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے ہوتے ہیں۔ ہم نے تو اپنی ہوائے نفس ہی کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے جیسا کہ جناب رَبُّ العزت اپنے محبوب سے ارشاد فرما رہا ہے:۔

اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ﴿۲۳﴾ جاثیہ

(اے میرے حبیب) کیا تم نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔

اب جبکہ دنیا میں ہر طرف مسلمانوں پر مصائب اور بلائیں آرہی ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ رَب کی طرف رجوع کریں، ورنہ اُس کے عذاب سے کہیں مفر نہ ہوگا۔

اُدھر مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کے مظالم کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر طرف مسلمانوں پر تباہی آئی ہوئی ہے اور یہ خبریں آپ روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جو ایسی خبریں شائع نہ ہوتی ہوں۔

کیوں پیارے بھائیو! کیا اپنے برادرانِ دینی پر ہونے والے مظالم کی داستانیں سننے اور پڑھنے سے بھی تمہارے قلوب رب کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اگر ہم نے اب بھی ماننے کے اصلی معنی میں خدا کو ماننے کی کوشش شروع نہ کی تو جان لو کہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ مصیبت میں تو ہمیشہ خدا یاد آتا

ہے مگر نا معلوم ہمارے دلوں میں کیسی قساوت پیدا ہوگئی ہے کہ اپنے بھائیوں پر ہونے والے مظالم کی داستانیں سن کر بھی خدا کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ دیکھو ہمارا رب تو فرما رہا ہے:۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾ قصص

انہوں نے کہا یہ تو بس بنایا ہوا جادو ہے۔ ہم نے تو اپنے اگلے باپ دادوں سے ایسی باتیں سنی ہی نہیں۔

اب تو سوائے نادان جاہلوں کے اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ نئی باتیں ہیں۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس ہوگئے۔ ہر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ الفاتحہ (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)۔

ظاہر ہے خدا کی بندگی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک غیر اللہ کی بندگی سے نہ نکلیں۔ لہٰذا پہلی دُعا ہماری یہی ہوتی ہے کہ اے رب ہمارے ہمیں اپنے غیر یعنی نفس و شیطان کی بندگی سے نکال کر اپنا بندہ بنالے۔ تاکہ ہم صرف تیری ہی بندگی کریں اور یہ بغیر تیری مدد کے ہو نہیں سکتا۔ یہ تو ہماری طاقت و قوت سے باہر ہے۔ تیری مدد کے بغیر ہم نفس و شیطان کی بندگی سے نکل ہی نہیں سکتے۔ ہماری مدد کر اور اپنے غیر کی بندگی سے نکال کر اپنا بندہ بنالے۔

اس کے بعد عرض کرتے ہیں:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ الفاتحہ (اے رب ہمارے ہمیں اپنا سیدھا راستہ دکھا اور اس پر چلا)۔

اور صراط مستقیم کیا ہے۔ یہ سورہ یٰسین میں بتلا دیا ہے۔

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ یٰسین

اور یہ کہ صرف میری بندگی کرنا یہی سیدھا راستہ ہے۔

یعنی تمہارا ہر کام میرے لئے ہو۔ ہر عمل فریضۂ فطری ادا کرنے کو ہو نہ کہ اپنے نفس کی خواہشات

کی تسکین کے لئے۔اس کی تو ہر مسلمان روزانہ دُعا کرتا ہے مگر کہنے والا خود ہی نہیں جانتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔اُس کو تو یہ پٹی پڑھا دی گئی ہے کہ بس طوطے کی پڑھ لینا ہی بڑا ثواب ہے۔

افسوس کہ اِس مقدس دینِ فطرت کو کیسا مسخ کر دیا گیا ہے۔اِس کو تو ہر مسلمان سمجھتا ہے کہ خدا کا سیدھا راستہ یہی ہے کہ انسان برائیوں سے بچ سکے اور خدا کے احکام پر عمل کرے۔قرنِ اوّل کے مسلمان ہر نماز میں صدقِ دل سے یہ دعا کرتے تھے تو ان کی استدعا قبول ہوتی تھی۔

اُن کی تو مادری زبان تھی۔وہ تو سمجھ کر کہتے تھے مگر بعد کو بے سمجھے طوطے کی طرح پڑھنے لگے۔ بھلا طوطے کو کیا ثواب مل سکتا ہے۔اب بھی اگر صدقِ دل سے دعا کرنے لگیں تو خدا کی نعمتوں سے سرفراز ہوں۔اس کے وجود کا یقینِ قلبی حاصل ہو جائے اور اس کو صحیح معنوں میں ماننے لگیں۔

جس مسلمان کو اتنی بھی طلب نہ ہو کہ وہ صدقِ دل سے **ایاك نعبد و ایاك نستعین** کہے اور بارگاہ رب العزت میں سچے دل سے دعا کرے کہ رَبّا!

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵ الفاتحہ (اے رب ہمارے ہمیں اپنا سیدھا راستہ دکھا اور اس پر چلا)۔

یعنی مجھے برائیوں سے بچالے اور اپنے احکام پر عمل کرنے کی طاقت عطا فرما۔تو وہ کیسا مسلمان ہے۔وہ تو پکا منافق ہے۔

ہر قوم کو خالق کی طرف سے ایک مہلت دی جاتی ہے مسلمانوں کو چودہ سو سال کی مہلت ملی۔ چودھویں صدی کا تو اکثر جگہ ذکر آیا ہے مگر پندرھویں صدی کا کہیں ذکر نہیں۔اسی سے سمجھ لیں کہ اب مہلت قریب ختم ہے۔

لہٰذا نفاق سے نکلنے کی کوشش کریں اور مالک سے دعا کرتے رہیں کہ ہمیں اپنے وجود کا یقینِ قلبی عطا فرمائے۔اب اگر ایسا نہ کیا تو خدا کا عذاب قریب ہے۔دنیا میں بھی تباہی و ہلاکت میں گرفتار ہوں گے اور آخرت میں کفار و مشرکین کے عذاب سے کہیں زیادہ شدید عذاب میں ابدالآباد معذب رہیں

گے۔ مالک نے تو اس کی خبر دے دی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾	بے شک منافق لوگ (مان کر حکم نہ ماننے والے) جہنم کے سب سے نیچے (بدترین) طبقہ میں ہوں گے۔

النساء

پیارے بھائیو! خدا کے عذاب سے ڈرو۔ خدا کو ایسا تو مان لو جیسے کہ دنیا کی چیزوں کو مانتے ہو اور اسی سے دعا کرو کہ ہمیں صحیح معنوں میں ماننے کی طاقت اور اہلیت عطا فرمائے۔

دیکھو تمہارے بھائیوں پر ہر طرف تباہی آ رہی ہے۔ ان کے لئے بھی دُعا کرو اور اپنے لئے بھی اُس کی رحمت طلب کرو کہ ہمیں اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور گناہوں سے توبہ اور استغفار کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے حبیب کے صدقے سے جس کو سارے جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا، ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اللھم صل علی حبیبك محمدٍ سید الانبیاء و المرسلین
و اٰلہٖ و اصحابہٖ اجمعین من یومنا الی یوم الدین

خادم المسلمین
ابوالفارق واسطی

پیغامِ رسولؐ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بعد حمد ونعت خدمتِ برادرانِ اسلامی میں عرض ہے کہ اس بندۂ حقیر کو ایک ایسا موقع پیش آ گیا کہ ایک ہندو فلاسفر نے عقائد وعباداتِ اسلامی پر کچھ اعتراضات پیش کئے اور بعون اللہ تعالیٰ عقل وفطرت کی روشنی میں معترض کو جوابات دے سکا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے جو دہریت کے پروپیگنڈے کے زیر اثر مذہب سے بیزار ہو چکے تھے، بہت سے شکوک و اعتراضات سنے اور ہر ایک کو عقلی وفطری دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ جن میں سے بحمدُ للہ اکثر راہ راست پر آ گئے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں بندۂ حقیر نے ایک رسالہ ''پیغام رسولؐ'' شائع کیا تھا، جس میں حدیث ''من قال لا الہ الا اللہ وجبت لہ الجنۃ'' کی شرح بیان کی تھی۔ اِسی رسالہ کے باب دوم میں وہ سوالات جمع کر دیئے تھے۔ چاہتا تھا کہ ان کے مفصل جوابات شائع کروں مگر وہ مسودات اس وقت شائع کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اب ان تمام کو اس کتاب میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دہریت اور لادینیت کے پروپیگنڈے سے محفوظ رکھنے میں معین ہوں گے۔

آخر میں رسالہ ''پیغامِ رسولؐ'' کے باب دوم کی جس میں تمام سوالات درج تھے، پوری نقل شامل کر دی گئی ہے تا کہ مفصل سوالات ناظرین کی نظر سے گزر سکیں۔

ابوالفارق واسطی

بابِ اوّل

شرح

"من قال لا الہ الا اللہ وجبت لہ الجنۃ"

(حدیثِ رسولؐ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ الذی خلق السمٰوٰت و الارض یولج اللیل فی النہار ویولج النہار فی اللیل و الصلوۃ و السلام علی حبیبہٖ سید الصادقین و المتقین اشرف الانبیاء و المرسلین محمدؐ المصطفٰی وآلہ الطیبین الطاہرین و اصحابہ الطٰلحین من یومنا ھذا الی یوم الدین امّا بعد۔

بندہ عاصی برادران اسلامی کی خدمت میں پہلے ایک کیفیت قلبی کا ذکر پیش کرتا ہے جس کے بعد اصل مضمون پیش کروں گا۔وھو ھذا

ایک کیفیتِ قلبی کا ذکر (بارش کا واقعہ)

لکھنؤ میں یوسف حسین خان صاحب ایک مشہور بیرسٹر تھے۔صاحبِ جائدادِ کثیر، گویا ایک چھوٹے سے تعلقہ دار تھے۔ان کا ایک موضع ''بسہا''، لکھنؤ سے چھ میل جانب شمال واقع تھا جہاں کنکر بہ کثرت نکالتا تھا۔اس کے لئے بیرسٹر صاحب نے اس موقع میں کنکر کے چونے کا ایک کارخانہ قائم کیا ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں اس کارخانہ کا چارج میرے ہاتھ میں آیا۔

موضع کے مکھیا ایک دوبے جی (برہمن پنڈت) تھے، جو علمِ نجوم میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ان کا ایک بیٹا جس کی عمر تقریباً تیس سال کی ہوگی، اکثر کارخانے آتا۔اس کے ساتھ اکثر بات چیت ہوا کرتی۔

اُس طرف بارش اکثر ۱۵ جون کے قریب قریب شروع ہوجاتی تھی مگر اُس سال بہت تاخیر ہوچکی تھی جون کی آخری تاریخیں تھیں مگر بارش کا نام ونشان نہ تھا۔گرمی بڑی شدت کی پڑ رہی تھی۔لوگ

گرمی سے تڑپ رہے تھے۔ بارش کی دعائیں کر رہے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک روز مکھیا جی کے صاحبزادے تشریف لائے، دفتر میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ بارش کا ذکر آ گیا، پنڈت جی کہنے لگے:۔

''ابھی بارش نہیں ہوسکتی۔ جوتش میں مہورت ہی نہیں۔ ابھی تو پندرہ دن بارش نہ ہوگی''۔

میری زبان سے نکل گیا کہ:۔

''رب چاہے تو ہوسکتی ہے''۔

پنڈت بے ساختہ بولا:۔

''اجی رَب بھی چاہے تو کیا ہوسکتا ہے جب مہورت ہی نہیں تو بارش ہو ہی نہیں سکتی''۔

پنڈت جی کا یہ فقرہ ایک نشتر تھا جو دل میں اتر گیا۔ دل کی حرکت بہت تیز ہوگئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مالک کی طرف لَو لگ گئی۔ دل کہتا تھا کاش کہ یہ گستاخانہ فقرہ سننے سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔ فوراً ایسا ہوا جیسے کوئی دل میں ڈالتا ہے کہ کہہ دے ''بارش ہوگی''۔ میں نے فوراً بغیر ارادے کے ہی کہا۔ ''بارش ضرور ہوگی''۔ پنڈت جی مسکرائے اور بولے۔ ''اجی بارش نہیں ہوسکتی''۔ میں نے کہا۔ ''آج ہی ہوگی''۔ پنڈت نے کہا ''ممکن ہی نہیں''۔ میں نے کہا۔ ''ابھی ہوگی''۔ اور یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر زبان سے نکل رہا تھا۔

دل میں ایک اُمنگ سی اٹھ رہی تھی کہ آسمان کو دیکھ، میں آسمان کی طرف دیکھنے لگا پنڈت ہنستا رہا۔ اتنے میں ایک ابر نمودار ہوا۔ میں نے کہا دیکھو ابر نمودار ہو رہا ہے۔ اس پر پنڈت زور سے ہنسا اور بولا۔ ''اجی یہ کیا ہے؟'' اتنے میں وہ بتدریج بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر اُفق پر چھا گیا اور بارش ہونے لگی پھر خوب زور کی بارش ہوئی۔ میں سجدۂ شکر بجا لایا اور جتنے مسلمان وہاں اس وقت موجود تھے بہت خوش ہوئے اور سب نے پنڈت جی کو شرمندہ کیا فالحمد للہ رب العٰلمین۔

اُس وقت تو میں آبائی مذہب کا پجاری تھا۔ نہ دین کا پتہ نہ حقائق سے واقف، جہالت و لاشعوری

کی تاریکی میں غرق تھا پھر بھلا اس کیفیت کو جو اس وقت قلب پر وارد ہوئی کیا سمجھ سکتا تھا۔

جب کچھ ہوش آیا اور دین کے بعض راز معلوم ہوئے تو پتہ چلا کہ یہ کیفیتِ قلبی تو رَب کی بڑی نعمت ہے۔ اُسی کی طرف اِس آیہ وافی ہدایہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ عنکبوت

پس جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں، اس وقت اللہ کو خلوص دل سے پکارتے ہیں۔

جب یہ کیفیت قلب پر طاری ہوتی ہے تو جس شے کی انسان کو طلب ہوتی ہے، خواہ دنیا کی ہو یا دین کی مالک اس کو عطا فرماتا ہے۔ کیسا ہی مشکل مسئلہ ہو اسی وقت حل ہو جاتا ہے اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ ﴿٦٢﴾ نمل

کون ہے جو قبول کرتا ہے، پکار مضطر کی جب وہ اسے پکارے اور مصیبت کو دور کرتا ہے۔

یہی وہ کیفیت ہے جس کے طاری ہونے سے سائنس دانوں پر فطرت کے راز منکشف ہوتے رہے۔

مذکورہ بالا واقعہ کے بعد بھی اس کیفیت کے بعض اوقات تجربات ہوتے رہے مگر اپنی جہالت و نادانی کے سبب اس کی قدر و قیمت نہ سمجھ سکا۔ اب اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اصلِ مضمون

سنہ ۱۹۲۵ء میں، مَیں ڈیرہ دُون، یو۔ پی، انڈیا میں ایک چائے باغیچہ کے مالک کے ہاں مہمان تھا۔ چائے باغیچہ کے منیجر ایک کشمیری پنڈت تھے۔ جو فلاسفی کے گریجویٹ، بڑے قابل اور غیر متعصب شخص تھے۔ فارسی کے عالم اور ہندو فلسفہ کے ماہر تھے۔ شام کے وقت انہی پنڈت صاحب کے ساتھ جلسہ جمتا تھا۔

ایک دن پنڈت جی کہنے لگے کہ اسکول و کالج کے زمانہ میں ہوش سنبھالنے کے بعد تقریباً چھ

سات سال مسلمان دوستوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے مگر جب بھی مذہب کے متعلق گفتگو ہوئی اور میں نے اسلام کے متعلق اپنے شکوک و وساوس کا اظہار کیا جو معاندانہ نہ تھا بلکہ میں سمجھنا چاہتا تھا تو کسی سے کوئی معقول جواب نہ مل سکا بلکہ نتیجہ میں کچھ بے لطفی سی پیدا ہوگئی۔ بالآخر میں نے ایسا تذکرہ کرنا ترک کردیا۔

پنڈت جی کی اس تقریر سے مجھے کچھ ناگواری محسوس ہوئی اور بالکل غیر ارادی طور پر کہنے لگا کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ مسائلِ دینی کے اغراض وعلل ظاہر کرسکے یا شکوک و وساوس کا تسلی بخش جواب دے سکے۔ آپ کے ذہن میں اسلام کے متعلق جو اعتراضات ہوں، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ آپ خواہ کیسے ہی الفاظ استعمال کریں، مجھے ناگواری کا احساس نہ ہوگا اور اپنی بساطِ علم وفہم کے مطابق آپ کی تسکین کردینے کی کوشش کروں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

یہ سن کر پنڈت جی خوش ہوگئے اور کئی ہفتے تک ان سے سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ وہ ایک اعتراض پیش کرتے تھے جس کا جواب سننے کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا جہاں تک یاد ہے تقریباً چھ اعتراضات پر گفتگو ہوئی۔

جس وقت پنڈت جی سے یہ بات چیت ہوئی تو رات کے تقریباً نو بج چکے تھے۔ لہٰذا بات کل پر رکھی گئی اور جلسہ برخواست ہوگیا جب میں خواب گاہ میں پہنچا تو خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کیا، اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ معلوم نہیں وہ کیا سوالات کریں۔ مجھے دین کے متعلق کچھ علم نہیں میں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم نہیں پائی۔ اگر خدانخواستہ معقول جواب نہ دے سکا تو یہ دین کی سُبکی ہوگی۔ میں نے یہ کیا کرلیا۔

اس خیال سے ہی قلب میں لرزہ پیدا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل سے یہ دعا نکلی۔ ''مولا تیرا دین ہے۔ تو ہی اس کی نصرت کرے گا۔ مجھ جاہل نادان سے غلطی ہوگئی ہے۔ اب سنبھالنے والا تو ہی ہے''۔

بس تھوڑی دیر میں دل میں قوت پیدا ہوگئی اور سکون ہو گیا۔ دوسرے دن پنڈت جی سے گفتگو شروع ہوئی۔ پنڈت جی کے ہر سوال پر دل میں تڑپ پیدا ہوتی تھی۔ مالک سے نصرت طلب کرتا تھا اور فوراً جواب ذہن میں آجاتا تھا۔

الغرض دوسرے دن شام کو جب جلسہ جما تو میں گھبرا رہا تھا۔ توجہ مالک کی طرف تھی۔ خیال آتا تھا۔ کہاں ایک فلاسفی کا گریجویٹ اور کہاں ایک معمولی پڑھا لکھا تقریباً جاہل۔ مگر اب قدرتِ خدا کا تماشا دیکھیں اور رَب کا شکر بجالائیں کہ اس نے ایک نادان جاہل کے ذریعہ سے اپنے دین کی تائید فرمائی۔ غرض یہ کہ جب پنڈت جی اطمینان سے بیٹھے تو سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔

پنڈت جی کے اعتراضات مع جوابات

پہلا اعتراض (قربانی پر)

پنڈت جی کہنے لگے:۔

''میں نے اکثر مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ وحشی اقوام کے عقائد کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بچے کی فطرت تو صحیح ہوتی ہے مگر ماں باپ اس کو خلاف فطرت عقائد کی طرف تاویلات باطلہ سنا سنا کر راغب کر لیتے ہیں۔ ایک مثال تو ہمارے سامنے امیر علی ٹھگ کی موجود ہے۔ جو میں نے ''ٹھگ کے اعتراف جرم'' (Confessions of a thug) میں دیکھی کہ اس کے ماں باپ کو ٹھگوں نے قتل کر دیا تھا اور بچے کو خود پرورش کیا جب وہ کچھ سمجھنے کے لائق ہوا تو ایک روز اپنے مفروضہ باپ سے کہنے لگا:۔

''بابا ہم تو مسلمان ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں پھر ہمارے یہاں آدمیوں کو مار ڈالنے اور ان کا مال چھین لینے کا کام کیوں ہوتا ہے۔ یہ کام تو اچھا نہیں ہے''۔

باپ نے کہا ''دیکھو اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ آدمی تو ہے نہیں جو خود کام کرے۔ اس کے سارے کام بندوں کے ذریعہ سے ہوتے ہیں وہی بیماروں کو شفا دیتا ہے۔ یہ کام طبیبوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ وہ رازق ہے تو اناج کاشتکاروں کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کا مظہر انسان ہی ہے۔ اب یہ آدمی کا کام ہے کہ وہ جس صفت کا مظہر بننا چاہے بن جائے۔ تو اللہ تعالیٰ قہار بھی ہے۔ وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ ہم نے اس کی صفتِ قہاری کا مظہر بننا پسند

کیا۔پس اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو مارنا چاہتا ہے۔ ہم اس کا ذریعہ اور واسطہ ہوجاتے ہیں۔ بتاؤاس میں کیا خرابی ہے‘‘؟ یہ سن کراس بچہ کوتسلی ہوگئی۔

بعض وحشی اقوام کے عقائد بھی معلوم ہوئے۔مشرقی بنگال کے پہاڑی علاقوں میں کچھ قبائل آباد تھے۔ان کے یہاں ہر تیسرے سال انسانی قربانی دی جاتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مریا قوم کے آدمی کی قربانی دیوتاؤں کو بہت زیادہ پسند ہے۔

چنانچہ وہ ’’مریا‘‘ قوم کے ایک آدمی کو موقع پا کر پکڑ لاتے۔اس کو خوب آرام سے رکھتے۔عمدہ غذائیں کھلاتے اس کے سر کے بال بڑھائے جاتے جب بال خوب لانبے ہوجاتے تو ایک دن قربانی کا مقرر کیا جاتا۔دیوتاؤں کے مندروں کے پجاری جمع ہوتے بڑا پجاری ان سے ایک گڑھا کھدواتا جس کے ایک کنارے پر ایک لکڑی گاڑ دی جاتی۔ پھر گاؤں کے سب مرد،عورتیں جمع ہوتے اور دیوتاؤں کے لئے ڈھول بجا بجا کر گانا اور ناچ شروع ہوتا اور قربانی کے آدمی کو سر کے بالوں سے لکڑی پر باندھ کر لٹکا دیا جاتا۔پھر بڑا پجاری منتر پڑھ پڑھ کر لٹکے ہوئے آدمی کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کاٹتا۔

ان کا عقیدہ تھا کہ قربانی کا آدمی جتنا زیادہ چلائے گا اور تڑپے گا،دیوتا اتنے ہی زیادہ خوش ہوں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہمیں برکت دیں گے۔ اسی لئے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کاٹے جاتے۔جب تمام گوشت جسم سے اتار لیا جاتا تو سر کاٹ کر ہڈیاں اس گڑھے میں دبا دیتے۔گوشت کے ٹکڑے سب آدمیوں پر تقسیم کردیتے۔وہ ان کو برکت کے لئے اپنے کھیتوں میں دبا دیتے اور سر گاؤں کے سوانہ پر دفن کیا جاتا تاکہ گاؤں بلاؤں سے محفوظ رہے۔

ایسے فاسد اور بے عقلی کے عقائد کو جہلاء دین و مذہب سمجھ لیتے ہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمشکل اس قربانی کو بند کرایا۔

مذہب حق تو وہی ہوگا جو خدا کی طرف سے ہو۔ سچا دھرم تو دیا دھرم ہے۔ ہم تو گیان[۱]، دھیان[۲]، بُھگتی[۳] کو خدا کا دین جانتے ہیں۔ اس کو تو ہر شخص تسلیم کر لے گا کہ جو مذہب خدا کی طرف سے ہوگا، صفات حسنہ کی تعلیم دیگا۔ رحم وکرم، شفقت علی الخلق سکھائے گا۔ اس سے کوئی فرد بشر انکار نہیں کرسکتا کہ زیر دستوں پر مہربانی کرنا فریضۂ انسانیت ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ بے زبان جانوروں سے اچھا سلوک کرے۔ ان کو سیر وسیراب رکھے۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لے۔

اگر اس اصولِ انسانیت پر عوام عمل نہیں کرتے تو حکومتیں ایسا قانون بناتی ہیں جو جانوروں پر ظلم کرنے سے روکے۔ مگر مسلمانوں کے حال پر حیرت ہوتی ہے کہ بے زبان جانوروں کو بیدریغ ذبح کر کے حصولِ ثواب کی تمنا کرتے ہیں۔

اسلام کو خدائی مذہب کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی سال میں ایک دن مقرر کر رکھا ہے کہ اس روز ہر مسلمان وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرے اور بے زبان جانوروں کو ذبح کر کے ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھ کر تقرب خداوندی حاصل کرے۔

ہندوؤں میں بھی بعض وحشی قومیں دیوی دیوتاؤں کے لئے جانوروں کی قربانی کرتی ہیں جس پر مسلمان ان کو خونی دیوتا کہہ کر مضحکہ اڑاتے ہیں، مگر اپنے ارحم الراحمین خدا کو نہیں دیکھتے کہ ہر سال ہزاروں قربانیاں مانگتا ہے۔ ہندوؤں کے دیوی دیوتا تو چند قربانیوں کی وجہ سے خونی دیوتا کہلائیں مگر مسلمانوں کا خدا بے شمار جانوروں کا خون زمین پر بہتا دیکھ کر خوش ہونے کے باوجود ارحم الراحمین ہی رہے۔ واہ صاحب

---

[۱] گیان: معرفت

[۲] دھیان: یکسوئی توجہ

[۳] بُھگتی: خدمتِ خلق

واہ! کیا پاکیزہ مذہب ہے اور کیسے بافہم اہل مذہب؟

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

الجواب بعون الوہاب

پنڈت جی کے طول طویل فلسفیانہ تقریر کے دوران میرے ہوش وحواس تو ضرور گم ہوتے رہے مگر مالک کی طرف خلوص سے لَو لگی رہی۔ پنڈت جی کی تقریر ختم ہوتے ہی زبان کھل گئی۔

اب میری باری تھی۔ میں نے کہا، کوئی معقول انسان ایسا نہیں ہوسکتا جو اس سے انکار کر سکے کہ رحم وکرم اور شفقت علی الخلق ہی صفاتِ انسانیت ہیں۔ جب تک آدمی میں یہ صفات پیدا نہ ہوں، انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ جب یہ مانی ہوئی سچائی ہے تو مذہب پر بھی اسی کلیہ کی روشنی میں نظر ڈالنی ضروری ہے اور یہی صداقت کی کسوٹی ہے۔ اس لئے کہ مذہب اسی راستے کو کہتے ہیں جس پر چل کر آدمی جو اپنی خواہشات وجذبات کی تسکین میں بہائم کی مثل زندگی گزارنے کے سبب چوپاؤں سے بدتر ہے، بلند ہوسکے اور ہوا وہوس پر غلبہ حاصل کر کے منزلِ انسانیت میں داخل ہو کر مخلوقِ خدا کے لئے رحم وکرم، شفقت ومحبت کا مجسمہ بن سکے۔

اسی اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قربانی عیدالاضحیٰ پر بھی نظر غائر ڈالنی ضروری ہے مگر اس کے لئے بہت غور وفکر کی ضرورت ہے۔ ظاہر بینوں کو تو یہ عمل وحشت وبربریت کا مظاہرہ معلوم ہوتا ہے مگر ممکن ہے، اس کا مقصد رحم وکرم اور شفقت علی الخلق کی حفاظت ہو اور دیا و دھرم کی بقا اور صیانت کے لئے کیا جاتا ہو۔

آیئے اس پر گہری نظر ڈالیں اور نفسیاتی راز تلاش کریں۔ اس کے لئے پہلے فطرتِ انسانی کا مطالعہ ضروری ہے۔

بچے کو دیکھئے اپنے ہم سن کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ کھیلے، اس سے بات چیت کرے۔ اگر ساتھ کھیلنے والا کوئی بچہ نہیں ہوتا تو گھبراتا ہے۔ گھر والوں کو

تنگ کرتا ہے۔ تلاشِ رفیق اور ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اس کی فطرت ہے بلکہ یہ جذبہ قریب قریب تمام چوپاؤں، چرندوں اور پرندوں میں بھی موجود ہے۔

بہت عرصہ ہوا کہ ایک روزنامہ میں ایک مضمون زیر عنوان ''تلاشِ رفیق'' شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے اپنے مشاہدات سے اس کا ثبوت پیش کیا تھا کہ طیور و بہائم میں بھی یہ جذبہ موجود ہے۔ اصل مضمون من وعن تو یاد نہیں البتہ اس کا لبِ لباب اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

مضمون نگار نے لکھا تھا کہ میرا مکان ایک بڑے تالاب کے نزدیک واقع تھا۔ میں روزانہ شام کو اس کے قریب بیٹھا کرتا تھا۔ تالاب میں راج ہنس کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ کسی شکاری نے ایک روز اس جوڑے میں سے ایک کو شکار کر لیا۔ دوسرا نہایت مضطرو پریشان چیختا پھرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فریاد وفغاں کر رہا ہے۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ اس کے چلانے سے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔

چند روز یہی کیفیت رہی۔ پھر ایک روز سکون ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ خوش خوش اسی طرح پھر رہا ہے۔ جیسے اپنے جوڑے کے ساتھ پھرا کرتا تھا۔ اب مجھے اس کی جستجو ہوئی کہ اس کی تسکین کا کیا سبب ہے؟

بالآخر ایک روز دیکھا کہ ایک بڑی مچھلی اس کے ساتھ ہے۔ جس طرف وہ جاتا ہے، اسی طرف مچھلی بھی جاتی ہے اور اگر مچھلی اپنا رُخ بدلتی ہے اور کسی دوسری سمت کو چل پڑتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اسی سمت کو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ اس نے اس مچھلی کو اپنا رفیق بنا لیا ہے جس سے اس کو سکون مل گیا۔

ایک روز ایک شخص مچھلی کے شکار کے لئے تالاب پر آیا اور کانٹا ڈالا۔ اس وقت میں بھی تالاب کے کنارے بیٹھا تھا۔ اتفاق سے وہ ہی مچھلی کانٹے میں پھنس گئی۔ جب ڈور کھینچنی شروع کی تو میں نے دیکھا۔ راج ہنس بھی مچھلی کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔ جب مچھلی کنارے پر آ گئی اور اس کو باہر کھینچنا چاہا تو راج ہنس نے شکاری پر حملہ کر دیا۔

یہ دیکھ کر میں نے شکاری کو تمام حالات سنائے اور سفارش کی کہ اس مچھلی کو چھوڑ دے ورنہ یہ راج ہنس پھر فریاد و فغاں کرنے لگے گا۔ اس کی فریاد ہم سے سنی نہیں جاتی جب یہ فریاد کرتا ہے تو میرے گھر کے سب لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ پس میری خوشامد کرنے پر اس نے کانٹا نکال کر مچھلی کو چھوڑ دیا۔ راج ہنس بہت خوش ہوا اور مچھلی کے ساتھ ساتھ تیرتا چلا گیا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا صرف یہی مقصد تھا کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ تلاشِ رفیق کا جذبہ حیوانات میں بھی موجود ہے۔ انسان بھی تنہائی سے گھبراتا ہے اور ہم جنسوں کے ساتھ مل کر رہنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔

لہٰذا بستیاں، قصبے اور شہر آباد کرتا ہے اور آبادی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ جب بکثرت افراد یکجا ہو جاتے ہیں تو خواہش تمدن کی تسکین ہو جاتی ہے۔ پھر دیگر خواہشات و جذبات کی تسکین میں مصروف ہو جاتا ہے اور دوسرے ہم جنسوں کی خواہشات و جذبات کا خیال رکھے بغیر اپنے خواہشات و جذبات کی تسکین اور اپنے اغراض کی تکمیل پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مال و دولت کی محبت اندھا کر دیتی ہے۔ دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنی ہوس کی تشفی کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا اور یہی باعث فساد ہے۔

ان مظالم و مفاسد کو روکنے کے لئے ایک قومی نظام کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ طاقتور کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکا جائے اور زیادتی کرنے والوں کو سزا دی جاسکے اگر ہر شخص میں رحم و کرم، شفقت علی الخلق، ایثار و ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں اور اتنے قوی ہوں کہ دوسرے جذبات سے مغلوب نہ ہو سکیں تو ہمیشہ امن قائم رہے اور کسی قوی نظام حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ہر شخص آزادی اور سکون سے زندگی گزار سکے مگر دنیا میں بلند اخلاق کے حامل اور دیا و دھرم پر عامل شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ کثرت ان افراد کی ہے جو خود غرض، طامع، حاسد اور عیش پرست ہیں۔

ہر شخص کا جذبۂ راحت پسندی اس کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ خوب دولت جمع کرے۔ تا کہ آئندہ زندگی میں محنت و مشقت سے محفوظ رہ کر عیش و عشرت میں زندگی بسر کر سکے۔ جذبۂ انانیت اس کو نام و نمود، عزت و شہرت و جاہت ظاہری کے حصول کی کوشش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اہلِ دولت کو اس کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے مال و دولت صرف بھی کرتے ہیں۔ بعض موقعوں پر تکلیف بھی اٹھاتے ہیں اور اس طرح ایک خاص گروہ میں وقعت حاصل کر لیتے ہیں مگر چونکہ اس ظاہری ایثار و خدمتِ خلق میں بے غرضی اور خلوص نہیں ہوتا۔ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے میں ناکام ہی رہتے ہیں۔ عوام کے دلوں کو تو وہی مسخر کر سکتا ہے جس کو نام و نمود کی خواہش نہ ہو بلکہ اس کا مقصد ہی خدمتِ خلق ہو۔ اس کے معاوضہ میں نام و نمود، عزت و شہرت یا شکر گزاری کا خواستگار نہ ہو۔

پس اگر کسی بستی میں ایک معمولی حیثیت کا شخص بے غرضانہ خدمتِ خلق میں مصروف رہے تو لازمی ہے، اس کی عزت و شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر لے گا۔ ہر شخص اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آئے گا۔ مغرور خود پسند امراء کے مقابلہ میں اکثر افراد اس کو ترجیح دیں گے۔ خبیث النفس امراء کو حسد پیدا ہوگا۔ اس کو نقصان پہنچانے، کسی معاملہ میں پھنسا کر ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اگر سوء اتفاق سے کوئی ایسا معاملہ پیش آ گیا جس میں کسی شے یا جگہ کی ملکیت کے متعلق کسی مغرور رئیس کو اس شخص سے تنازع کرنے کا موقع مل گیا اور رئیس مذکور نے اس پر تشدد کرنا چاہا تو عوام کی اکثریت اس مخلص خادم کا ساتھ دے گی اور رئیس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ جو اس کی آتشِ حسد و عداوت کو بھڑکانے کا سبب ہوگا۔ اور اس غریب کی ایذاء رسانی پر آمادہ ہو جائے گا۔

ہوسکتا ہے اپنی آتشِ حسد کو بجھانے کے لئے اس کے قتل کے منصوبے سوچنے لگے۔ اب فرض کریں یہ دولت مند کچھ شریر النفس بدمعاشوں کو مال و دولت کا لالچ دے کر ان کے دین و ایمان کو خرید لے اور اس نیک نفس، خادمِ خلق کے مکان کو لوٹ لینے اور اس کو قتل کر دینے پر آمادہ کر لے۔

پس جس وقت یہ حملہ آور اس کے مکان میں داخل ہوں تو اس کو کیا کرنا چاہئے۔ کیا اپنے کو ان کے حوالے کر دے؟ ہر شخص یہی فیصلہ کرے گا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح اپنے کو دشمن کے حوالہ کر دینا ذلت و خواری ہے۔ حتی الامکان اپنی حفاظت کرنا لازمی ہے بدمعاشوں پر اس کو بھی حملہ کرنا چاہئے۔ ایک دو کو تو

زخمی کر ہی دے گا اور ہوسکتا ہے اس سے کوئی ہلاک بھی ہو جائے اور سب راہ فرار اختیار کریں۔

اب آپ بتلائیں کہ صاحبانِ انصاف میں سے کوئی شخص اس غریب مخلص خادم کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے؟ اس پر پنڈت جی کہنے لگے۔ ''ہرگز نہیں، ایک منصف کے لئے اس کے خلاف کچھ کہنا ممکن نہیں''۔

میں نے کہا پنڈت جی ایک مشکل یہ پیش آئے گی کہ جس شخص نے ہمیشہ رحم و کرم اور شفقت علی الخلق میں عمر گزاری ہو اس کے لئے ان حملہ آوروں پر ہتھیار اٹھانا کیسے گوارا ہوگا اور اگر دل مضبوط کر کے کسی پر وار کر بھی دیا اور خون کی دھار اچھلی تو اس کو دیکھ کر اپنے ہوش وحواس کیسے قائم رکھ سکے گا۔ جس شخص نے کبھی خون کی دھار اچھلتے کسی کو زخم کھاتے دیکھا ہی نہیں، وہ حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کیسے کر سکتا ہے۔

دیکھئے اسپتالوں میں سرجنوں کے ساتھ جو ملازمین آپریشن روم میں کام کرتے ہیں ان کو کافی مدت اس پر صرف کرنا پڑتی ہے کہ اعضائے جسم کو کاٹتے چھانٹتے اور خون بہتا دیکھنے کی عادت ہو جائے ورنہ جس شخص کو عمل جراحی دیکھنے کی عادت نہیں ہوتی، اس کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ اسی لئے آپریشن کے وقت صرف وہی ملازمین آپریشن روم میں رہتے ہیں جن کو چیر پھاڑ کا عمل دیکھتے رہنے کی عادت ہو چکی ہو۔

اس بات کو تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ نفسِ انسان میں خون کی دھار اچھلتے دیکھ کر غیر متاثر رہنے کی اہلیت بتدریج پیدا ہوتی ہے۔ دفعتاً ایسا بن جانا ممکن نہیں۔

اس بات کو ملحوظ خاطر رکھیں اور پھر اصل مطلب کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ میں ایک خادمِ خلق کی مثال پیش کر چکا ہوں، اگر بدمعاش اس کو قتل کر دیں، اس کا اسباب لوٹ لیں، مکان جلا دیں اور یہ مقدمہ دنیا دھرم کی عدالت میں جج صاحبان کی پوری بنچ کے سامنے پیش کیا جائے تو سب بالاتفاق یہی فیصلہ صادر کریں گے کہ شریر النفس قاتلوں کو سخت عذاب دے کر ہلاک کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور

خادمانِ خلق محفوظ اور مصون رہ سکیں۔

پس اگر قوی نظامِ حکومت قائم ہے تو یہ کام حکومت انجام دے گی اور اگر کوئی مضبوط حکومت موجود نہ ہو تو بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اس لئے کہ شریر النفس بدمعاشوں کی جماعت کا مقابلہ کرنا جن کی حمایت پر ایک متمول صاحب وجاہت ہو بغیر جماعت کثیر ممکن نہیں، گروہ کا مقابلہ گروہ ہی کر سکتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے اشخاص جو رحم و کرم اور دیا دھرم کی بقا چاہتے ہوں مجتمع ہو جائیں اور بانیانِ فساد سے انتقام لیں اور ان کو قرار واقعی سزا دیں مگر اس کام کے لئے وہی لوگ آمادہ ہوں گے جن میں قربانی کا جذبہ ہو اور ان کے نفسوں میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ خون کی دھار اچھلتی دیکھ کر غیر متاثر رہ سکیں۔

میں نے ایک کریم النفس بزرگ کو خود دیکھا ہے کہ ایک بدمعاش ان سے برسرِ پرخاش ہوا۔ ان کو نقصان پہنچانے کے لئے ان کے قریب گیا۔ چاہتا تھا کہ حملہ کرے۔ اس بزرگ نے ایک خاردار لکڑی بدمعاش کے سر پر دے ماری۔ وہ زخمی ہوا، خون کی دھار اچھلی تو اس کو دیکھ کر بزرگ موصوف کو چکر آ گیا۔ قریب تھا کہ گر جاتے۔ حُسنِ اتفاق کہ اُسی وقت اُن کے چند اعزہ و ملازمین مکان میں داخل ہوئے اور ان کو دیکھ کر دوڑ پڑے۔ کسی نے ان کو سنبھالا۔ دوسروں نے بدمعاش کو قابو میں کر لیا۔ اگر اس وقت اور لوگ نہ آ گئے ہوتے تو یہ بدمعاش ان کو سخت نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ بزرگ کبھی کسی جانور کو ذبح نہ کرتے تھے بلکہ اپنی عمر میں کبھی ایک مرغ بھی ذبح نہ کیا تھا۔

ان تمام معروضات سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ ہر اس شخص کے لئے جو رحم و کرم اور شفقت علی الخلق اور دیا دھرم کا حامی ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ دیا دھرم کی حفاظت کے لئے اس کے نفس میں یہ اہلیت بھی ہونی لازمی ہے کہ خون کی دھار اچھلتے دیکھ کر، اعضاء جسم کٹتے دیکھ کر، لاشوں کو تڑپتا دیکھ کر ہوش و حواس قائم رکھ سکے، اور یہ اہلیت بغیر مشق کے نہیں ہو سکتی۔ جب تک عادت نہ ڈالی جائے یہ اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اب صاحبان انصاف خود ہی فیصلہ کریں کہ نفس انسان کو یہ مشق کیسے کرائی جائے۔ کیا اس کے لئے انسانوں کو تختۂ مشق بنایا جا سکتا ہے؟

پس اگر رحم و کرم، شفقت علی الخلق اور دیا دھرم کی حفاظت کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے کچھ جانور ذبح کر دیئے جائیں تو اس کو ظلم و بربریت سے تعبیر کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی لئے اسلام نے ہر مسلمان پر عید الاضحیٰ میں ایک جانور قربان کرنا لازم کر دیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔

پھر دفعِ فساد اور قیامِ امن کے لئے وہی لوگ آمادہ ہوسکتے ہیں جن میں مالی قربانی کا جذبہ بھی ہو اور مال حلال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہوں۔ اس قربانی سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ مالی قربانی کی بھی عادت ہوجاتی ہے۔

احکامِ قربانی میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ گردن جدا نہ کی جائے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم بھی حکمت پر مبنی ہے۔ اعضاء جسم کے تمام کاموں کا تعلق اعصاب سے ہے اور اعصاب کا تعلق حرام مغز سے ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور گردن میں ہے۔

اگر گردن کی رگیں کاٹ دی جائیں اور پیچھے کی ہڈی قائم رہے تو قلب کی حرکت کچھ دیر قائم رہتی ہے اور حرکت جاری رہنے تک شریانوں سے خون خارج ہوتا رہتا ہے۔ اگر گردن جدا کر دی جائے تو قلب کی حرکت فوراً بند ہوجائے گی اور ذبیحہ کی بہ نسبت بہت کم مقدار خون کی خارج ہوگی۔

خون کھانے سے شقاوت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ذبح کرنے کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ مقدار خون کی خارج ہوسکے۔ جس کی بہترین صورت یہی ہے کہ گردن کی رگیں کاٹ دی جائیں اور سر جدا نہ کیا جائے جھٹکے اور ذبیحہ کے گوشت کے رنگ میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ ان ہی اسباب سے جھٹکے کا گوشت کھانا مسلمانوں کے لئے ممنوع ہے۔

پنڈت جی یہ سن کر خاموش ہوگئے اور سوچنے لگے۔ میں نے کہا، آپ حضرات کو عید الاضحیٰ کی قربانی پر ناگواری کا احساس محض گائے کی قربانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ورنہ کالی مائی اور اکثر دیوی دیوتاؤں کے لئے جانوروں کی قربانیاں بعض اہل ہنود بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کی طرف نظر نہیں جاتی۔

اب فرمایئے، آپ کی تشفی ہوئی یا نہیں یا اب بھی آپ کا اس پر اعتراض باقی ہے۔ کہنے لگے جواب معقول ہے، تو بندہ نے عرض کی یہ جواب تو آپ کی تسلی کے لئے ہے ورنہ یہ قربانی تو ایسی عظیم قربانی کی یادگار ہے جو حق وصداقت کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کے جذبات قلوب میں پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کی یادگار قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اس کے بعد پنڈت جی نے ایک عرصہ تک کچھ ذکر نہ کیا۔ ایک روز کہنے لگے۔ ''کیا میں اور سوال کر سکتا ہوں''۔ میں نے کہا۔ شوق سے جو چاہیں سوال کریں۔ میں آپ کے ہر اعتراض کو ٹھنڈے دل سے سننے کو تیار ہوں اور اپنی بساط فہم وعلم کے مطابق جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

دوسرا اعتراض (قرآن خدا کا کلام کیسے ہے)

پنڈت جی نے کہا:۔

''قرآن (کریم) کو آپ خدا کا کلام کہتے ہیں حالانکہ وہ آپ کو محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبانی ملا ہے۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہو گیا؟ اگر آپ کے پاس کوئی معقول دلیل ہو تو پیش کریں''۔

الجواب بعون الوہاب

بندے نے کہا، پنڈت جی آپ ہندو فلسفہ کے ماہر ہوتے ہوئے ایسا سوال کریں تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔

دیکھئے۔ جب کوئی شخص گیان حاصل کرنے کے لئے دھیان لگانے کی مشق کرتا ہے تو کیا چند سال میں وہ اس کیفیت کو نہیں پہنچ سکتا کہ جب دھیان لگا کر بیٹھے تو دنیا و مافیہا اور خود اپنے سے بھی بے خبر ہو جائے۔ بتلایئے کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

پنڈت جی نے کہا، ''اگر اہلیت ہو گی تو اس پر ایسا ایک وقت ضرور آجائے گا''۔

میں نے کہا کہ ''اب آپ ہی بتلائیں کہ ایسے استغراق کی حالت میں جو بات اس کے دل پر اترے گی، وہ کس کا کلام ہوگا، دھیان لگانے والے کا یا اس کا جس کا دھیان ہے؟''

اب پنڈت جی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے کہ ''وہ کلام دھیان لگانے والے کا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اسی ذات کا ہوگا جس کی طرف دھیان لگا یا ہوا ہے''۔

میں نے کہا، بس ایسی حالت میں جو کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل پر اترا اسی کو ہم کلام اللہ مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور باتوں کو قولِ رسول یا حدیث کہتے ہیں''۔

نزولِ وحی یا کلام اللہ کے دل پر اترنے کے وقت رسولِ پاک کی ایسی کیفیت ہو جاتی تھی کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے اور بے ہوشی سے طاری ہو جاتی، پیشانی مبارک پسینہ میں غرق ہو جاتی۔ اس کیفیت کے طاری ہونے کے بعد جب ہوش میں آتے تو فرماتے کہ یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ اس کو لکھوا دیتے۔ ایسا تمام کلام قرآن شریف میں جمع کر لیا گیا ہے۔ اسی کو تمام اہلِ اسلام کلام اللہ کہتے ہیں اور حقیقتاً وہ کلام اللہ ہی ہے۔

یہ سن کر پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اس پر کوئی اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔

تیسرا اعتراض (قران عربی میں کیوں نازل ہوا)

پھر ایک روز پنڈت جی کہنے لگے کہ:۔

''ایک وسوسہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اسلام تمام دنیا کے لئے ہے تو اللہ پاک نے قرآن عربی میں کیوں نازل کیا۔ کیا اللہ پاک کی زبان بھی عربی ہی ہے؟ اس کے سوائے اور زبانیں نہیں جانتے؟''

الجواب بعون الوہاب

بندہ نے عرض کی پنڈت جی یہ اعتراض تو خواہ کوئی سی بھی زبان ہو۔ ہر زبان پر ہوسکتا ہے مگر میں ٹالنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تفصیلی جواب پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ذرا غور کیجئے اور سوچ کر بتلائیے کہ جو خیال یا خواہش آپ کے ذہن یا دل میں پیدا ہوتی ہے وہ الفاظ میں ہوتی ہے یا اس کا اصل مفہوم ہوتا ہے، جس کو آپ اپنے لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

کہنے لگے کہ ''نہیں کوئی خیال یا خواہش لفظوں میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل مفہوم ہوتا ہے۔ میں کیا کہوں اس کے ظاہر کرنے کو میرے پاس الفاظ ہی نہیں۔ یہ تو نفس کے باطن کی کیفیت ہے۔ جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا''۔

میں نے کہا، بس اصل قرآن وہی اصلی مفہوم ہے جو قلبِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو لفظوں میں ظاہر فرمایا۔ دیکھئے ہر شے کے چار وجود ہوتے ہیں:۔

① وجودِ ذہنی، مثلاً کسی کو ''آفتاب'' کا خیال آیا۔ اس کے ذہن میں آیا آفتاب۔ یہ وجود ذہنی ہے۔

② وجودِ ملفوظی، مثلاً کسی نے کہا ''آفتاب''۔ یہ اس کا وجود ملفوظی ہے۔

③ وجودِ مکتوبی، کسی نے اگر لکھا ''آفتاب''۔ یہ اس کا وجود مکتوبی ہے۔

④ وجودِ حقیقی، اصل آفتاب خود ہی اپنا وجود حقیقی ہے۔

پس ایک قاری جب کسی آیت کو دیکھتا ہے اور تحریرِ قرآنِ کریم پر نظر کرتا ہے تو جو کچھ اس کے ذہن میں آتا ہے وہ وجودِ ذہنی ہے۔ جب تلاوت کرتا ہے تو جو آواز منہ سے نکلتی ہے وہ وجودِ ملفوظی ہے۔ جو کچھ اوراق پر لکھا ہوا ہے وہ وجودِ مکتوبی ہے۔ اب اصلی اور حقیقیِ قرآن کہاں ہے؟ اس کو خود قرآنِ کریم ہی بتلاتا ہے:۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ﴿۴۹﴾ عنکبوت

بلکہ وہ تو واضح نشانیاں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں، جن کو علم دیا گیا۔

قرآن کریم کا حقیقی مفہوم وہی جانتے ہیں جو علم میں کامل اور راسخ ہیں جن کو رَب نے علم عطا کیا

ہوا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کی ایک تعریف یہ بھی فرمائی ہے:۔

العلم نور یقذف اللہ فی قلب من یشاء۔	علم تو وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ ڈالتا ہے جس کے دل میں وہ چاہے۔

لہٰذا حقیقی قرآن جو نور ہے وہ تو ان ہی لوگوں کے سینوں میں اثر انداز ہوگا جن کو گیان مل گیا ہو۔ (صاحبانِ معرفت اولیاء اللہ)

اس کے باوجود اللہ پاک نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ القمر	اور ہم نے قرآن کو بہت آسان کر دیا ہے نصیحت کے لئے۔ پس ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

یعنی نصیحت تو اس سے ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بچہ بھی اس سے نصیحت پاسکتا ہے۔

(نوٹ:۔ یہ جواب تو معترض کے لئے تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن عربی ہی میں نازل ہوا)۔

چوتھا اعتراض (قرآن صرف عربی ہی میں کیوں رہا)

پنڈت جی کہنے لگے:۔

''ایک مہا گیانی (صاحب معرفت کامل) کے لئے تو ہر زبان میں مطلب کا اظہار ممکن ہے۔ ایک مہا گیانی کو کوئی زبان یا علم کسب سے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صاحب مہا گیانی تھے تو قرآن صرف عربی ہی میں کیوں رہا، کسی اور زبان میں بھی کیوں نہ لکھوایا؟ جب بقول اہلِ اسلام وہ تمام دنیا کے لئے ہے اور ان کے رسول ساری دنیا کی ہدایت کے لئے تھے۔

الجواب بعون الوہاب

عرض کیا یہ تو آپ کا عجیب سوال ہے۔عرب میں کسی اور زبان میں کیسے بیان کیا جاتا۔ وہاں اور زبانوں کے سمجھنے والے کہاں تھے؟

ممکن ہے کہ اب آپ یہ کہیں کہ اللہ پاک نے نزولِ قرآن کے لئے عرب ہی کو کیوں منتخب کیا؟ تو اس کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ جو کچھ میں سمجھ سکتا ہوں، بیان کروں گا۔ اصل حقیقت تو مالک ہی جانتا ہے۔ ہمیں تو کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ پاک کا فرمان ہے:۔

وَمَآ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۵﴾ الاسراء (نہیں دیا گیا تمہیں علم مگر بہت تھوڑا)۔

ہمیں تو ایک ذرہ کا بھی علم نہیں۔ علم تو اس وقت کہہ سکتے ہیں جب حقیقت معلوم ہو۔ ہمیں تو ایک ذرہ کی حقیقت بھی معلوم نہیں۔ میں تو اس علم کو صرف وقوف سمجھتا ہوں کہ ہمیں تھوڑی سی واقفیت ہے۔ علم تو ظاہر کا ہو یا باطن کا، اسی کے پاس ہے۔ وہی عالم الغیب ہے اور وہی عالم الشہادۃ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے عالم الغیب والشھادۃً وہ جسے چاہے علم کا نور عطا فرمائے۔

دیکھئے میں اپنی فہم کے مطابق چند وجوہ بیان کرتا ہوں۔ شاید آپ کی تسلی ہو سکے۔

① چھٹی صدی عیسوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل اور بعثت کے وقت عرب کی حالت تمام دنیا میں سب سے زیادہ خراب تھی۔ قتل و غارت، رہزنی، ظلم وتعدی، دغا بازی عام تھی۔ قبائل آپس میں برسرپیکار رہتے تھے، نسلاً بعد نسلاً انتقامی لڑائیاں جاری رہتی تھی۔ جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی جہالت و بداخلاقی دنیا میں اور جگہ نہ تھی۔ اس لئے جہاں سب سے زیادہ تاریکی تھی، وہیں سب سے زیادہ روشنی کی ضرورت تھی۔

② رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرآن کریم یہ بتلاتا ہے کہ ہم نے رسوؐل کو اس لئے بھیجا کہ وہ لوگوں کے نفسوں کا تزکیہ کرے اور ان کو علم وحکمت سکھلائے۔

هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۲﴾ الجمعہ

وہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا تا کہ ان پر ہماری آیتیں تلاوت کرے اور ان کے نفسوں کا تزکیہ کرے اور ان کو علم وحکمت کی تعلیم دے۔

یعنی ان کے نفسوں سے لاشعوری (Unconciousness) کی تاریکی دُور ہو اور علمِ حقیقی حاصل کر سکیں اور ان کو گیان حاصل کرنے کے طریقے سکھائے یعنی معرفت حاصل کرنے کے راستے دکھلائے۔

پھر اللہ پاک نے یہ بھی فرمایا کہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ انبیاء

ہم نے تم کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تو رسول کے لئے ضروری تھا کہ نسلِ انسانی کو عام فیض پہنچائے۔

گیان (معرفت) اور کمالاتِ روحانی کے حصول کی اہلیت تمام انسانوں میں تو ہو نہیں سکتی۔لہٰذا ضروری تھا کہ دنیا کی کثیر آبادی کو اتنا فیض ہی پہنچ جائے کہ ان کے لئے مادی ترقی کی راہ ہی کھل جائے۔ رحمتہ اللعالمین کی مہربانی سے زیادہ سے زیادہ لوگ فیضیاب ہوسکیں۔

ذہنی ترقی کا انحصار حُریتِ تفکر پر ہے جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔انسان کے لئے ذہنی غلامی بدترین لعنت ہے جو اس کو ہمیشہ جہالت کی تاریکی اور ذلت کے گڑھے میں ڈالے رکھتی ہے اور اُس وقت دنیا کا حال یہ تھا کہ گنے چُنے افراد یا خاندانوں نے سب کو غلام بنایا ہوا تھا۔ذہنی غلامی تمام عالم پر چھائی ہوئی تھی۔یورپ میں مذہبی عدالتیں (انکویزیشنز) قائم تھیں جن کے حکم سے بے شمار افرا کو ارتداد کے شبہ پر زندہ جلا دیا جاتا۔

بیماری کے لئے کہا جاتا کہ بدروحیں داخل ہوگئیں ہیں۔اس کا علاج محض جھاڑ پھونک سے کرنے کی کوشش کی جاتی۔ان حالات کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہر تعلیم یافتہ شخص اس زمانہ کے تاریخی

حالات سے واقف ہے۔

نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ جب کسی سے مرعوب ہوجاتا ہے تو اس میں آزادانہ غور وفکر کی صلاحیت نہیں رہتی۔ جب تک رعوب عنہ (جس سے مرعوب ہے) اس کے سامنے موجود ہے ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ حریتِ فکر اس کو میسر نہیں ہوتی، جس کے بغیر ترقی کرنا محال ہے۔ لہٰذا اُن بولتے بتوں کو مٹانا ضروری تھا جنہوں نے تمام عالمِ انسانیت کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا تھا تاکہ عالمِ انسانیت اس سے آزاد ہوکر حریتِ فکر کی نعمت حاصل کرسکے اور اس اہم کام کے لئے ایسی قوم کی ضرورت تھی جو دلیر، شجاع، سخت جان، جفاکش، جنگ جُو، صاحبِ عزم، موت سے کھیلنے والی اور تلوار کی دھنی ہو۔

یہ تمام صفات جہالت اور پستی کے باوجود تمام اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ عرب ہی میں موجود تھیں۔ خدا پر ایمان لانے کے اور آخرت کے یقین سے ان کے دماغ روشن ہوگئے۔ موت سے کھیلنا ان کے لئے پہلے ہی کوئی بات نہ تھی ایمان لانے کے بعد تو موت کے شائق ہوگئے۔ ہر مجاہد شوقِ شہادت میں جہاد کے لئے نکلتا تھا۔ اس لئے نزولِ قرآن کے لئے عرب ہی بہترین ملک تھا۔

③ ہر زبان میں اکثر الفاظ کئی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ''کھویا'' کے معنی ہیں ''گم کردیا'' اور اس سے مراد وہ ماوا بھی ہے جو دودھ سے بنتا ہے، یا مثلاً آپ کہتے ہیں۔ ''اب بولو کیا کہتے ہو؟'' اور ''یہ پودا بولو پھر اور کام کرنا''۔ عربی زبان میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں کہ ایک کلمہ بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اکثر کلمات ایسے ہیں جو ایسے مختلف معانی پر دلالت کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مثلاً ایک ''تولّٰی'' ہی کو دیکھ لیں۔ اس کے بہت سے معانی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔ محبت کرنا، روگردانی کرنا، حاکم ہوجانا، مالک ہونا وغیرہ۔ لہٰذا راز بیان کرنے کے لئے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

④ حرکات بدلنے سے اکثر الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ہر زبان میں ایسے بہت سے الفاظ ملیں گے مگر عربی ایسی زبان ہے جس کے تمام افعال کے مشتقات میں حرکت کی تبدیلی سے معنی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں۔ ایسے بہت سے الفاظ سے آپ خود ہی واقف ہیں۔ مثلاً عَالِم (جاننے والا)، عَالَم

(جہاں)، مُعلّمِ (سکھانے والا)، مُعلَّم (سکھایا ہوا) اس لحاظ سے بھی عربی ہی سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں راز بیان کئے جاسکیں اور اختصار سے بیان ہوسکے۔ تھوڑے سے الفاظ بہت زیادہ مطالب کو گھیر لیں۔

⑤ عربی زبان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مضارع کے صیغے حال و استقبال دونوں زمانوں کے لئے بولے جاتے ہیں جیسے تریٰ کے معنی ہیں۔ دیکھتا ہے تُو اور دیکھے گا تُو یا مثلاً تسیر چلتے ہیں اور چلیں گے۔ یہ بھی راز بیان کرنے کے لئے اچھا ذریعہ ہے۔

⑥ جب مختلف زبانوں کے لوگ شہروں میں ملتے ہیں۔ آپس میں معاملات ہوتے ہیں تو وہاں کی زبان پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے اور ایک عرصہ میں زبان خالص نہیں رہتی مگر صحرا اور دیہات میں جہاں باہر کے لوگوں سے میل جول نہیں ہوتا، وہاں کی زبان صدیوں تک خالص صورت میں باقی اور تغیر سے محفوظ رہتی ہے۔ عرب کی کثیر آبادی صحرا میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتی ہے لہٰذا وہاں اب تک تیرہ سو سال کی قرآنی زبان بغیر کسی تغیر کے محفوظ ہے۔ دنیا میں اس وقت کوئی دوسری زبان ایسی نہیں مل سکتی جس میں تیرہ سو سال میں تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں۔ اور اپنی اصلی قدیمی صورت میں باقی ہو۔ اس لئے بھی نزولِ قرآن کے لئے عرب ہی بہترین ملک تھا۔

⑦ اس تمام کے علاوہ اس زبان میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو عربی کے سوائے کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی اور وہ علم الاعداد ہے کہ اس کے حُروفِ تہجی کے ہر حرف کے لئے عدد مقرر ہیں۔ اس علم کے جس کو علمِ جفر کہتے ہیں خاص قواعد ہیں، جن کے ذریعہ سے کسی عبارت کے اعداد نکال کر ان سے حسب قواعد اور عبارتیں بن جاتی ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ ''اس میں ہر شے کا بیان ہے''۔ ایک آیت میں ہے۔ کوئی خشک و تر ایسا نہیں جس کا اس کتاب میں ذکر نہ ہو۔ ایسی ہی اور کئی آیات ہیں۔ پس ظاہراً قرآن میں ہر شے کا ذکر نظر نہیں آتا، البتہ باطن میں موجود ہے۔

اعداد کے ذریعہ سے علمِ جفر کا ماہر ہر شے کے متعلق معلومات کا استخراج کر سکتا ہے۔ اس علم کے جاننے والے چند صدی قبل تو کہیں کہیں شاذ و نادر پائے جاتے تھے، مگر افسوس کہ اب قریب قریب مفقود ہو گئے ہیں۔ اگر کہیں ایک آدھ ہو گا بھی تو وہ ظاہر نہیں کرتا۔

اب فرمایئے کہ عربی سے بہتر تو کیا اس کی مثل بھی کوئی دوسری زبان قرآن کے لئے موزوں ہوسکتی تھی؟

یہ سن کر پنڈت جی خاموش ہو گئے اور بہت دیر تک غور وفکر میں غرق رہے۔ بہت دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ''اب تو آپ نے کچھ اور وساوس پیدا کر دیئے''۔ اب تو وقت نہیں پھر کسی روز فرصت میں بات ہو گی۔

پانچواں اعتراض (قران میں ہر شئے کا ذکر کیسے ہوسکتا ہے)

ایک روز پنڈت جی کہنے لگے:۔

''آپ نے جو یہ کہا کہ ہر شے کا علم قرآن میں ہے۔ اس کو سوائے خوش عقیدگی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج یورپ اور امریکہ دنیا پر چھائے ہوئے نہ ہوتے۔ اگر آپ کا یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر وہ علوم مسلمانوں کو کیوں نہ سکھلائے گئے جن سے آج تک مسلمان دنیا میں سربلند رہتے۔ ایک صاحبِ فہم اس تخیل کو کیسے قبول کر سکتا ہے؟

الجواب بعون الوہاب

عرض کیا کہ پنڈت جی آپ کے اس سوال کے دو جُز ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ قرآن میں ہر شے کا علم کیسے ہوسکتا ہے۔ دوسرا جُز یہ ہے کہ اگر قرآن میں ہر شے کا علم ہے تو وہ لوگوں کو کیوں نہ سکھلایا گیا۔ تو پہلے حصہ کا صحیح جواب تو ایک گیانی (صاحبِ معرفت) ہی دے سکتا ہے۔ اس بندۂ حقیر کی کیا بساط مگر آپ کی تسلی کے لئے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔

دیکھئے اگر کوئی ایسا گیانی (صاحبِ معرفت) موجود ہو جس کو تمام قرآن کے ظاہر و باطن کا پورا علم ہو تو کیا کوئی سوال کرنے والا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہر شے کے متعلق سوال کر سکے اور جوابات سننے کے لئے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صَرف کر سکے۔ بتلایئے کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ پنڈت جی نے کہا۔ نہیں ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ اور ہر شے کے متعلق سوال بھی تو وہی کر سکتا ہے جو خود بھی ہر شے کا علم رکھتا ہو۔ میں نے کہا ہر سوال کرنے والا دس پانچ چیزوں کے متعلق ہی سوال کر سکتا ہے۔ اب اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر کوئی شخص بعض اشیاءِ عالم کے متعلق ایسے راز ظاہر کر دے جن کا جاننے والا اس وقت دنیا میں کوئی نہ ہو اور ان معلومات کے حصول کا کوئی ذریعہ اور وسیلہ بھی موجود نہ ہو تو صدیوں بعد جب معلومات کے وسائل اور آلات پیدا ہو جائیں اور ان کے ذریعہ سے ان اشیاء کے متعلق صحیح حالات معلوم ہو جانے پر صدیوں پہلی بتلائی ہوئی باتوں کی تصدیق ہو جائے تب تو تسلیم کرنا ہوگا کہ اس شخص کا عِلم کسبی نہ تھا بلکہ مالک کی طرف سے تھا یعنی وہبی عِلم تھا۔ پس اگر وہ یہ بھی کہے کہ مجھے یہ تمام عِلم قرآن سے حاصل ہوا ہے تو قرآن کی عظمت تو ظاہر ہو ہی جائے گی۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرامؓ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سب سے زیادہ عالم تھے۔ صحابہ کرامؓ علمی مسائل میں ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے بھی کتنی ہی مرتبہ مشکل مسائل حل ہونے پر کہا ہے:۔

"اگر (حضرت) علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا"

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہا کرتے تھے کہ:۔

"جو تمام علم قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ وہ تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سپرد کر دیا۔ اب مجھ سے پوچھ لو آسمان کے متعلق یا زمین کے متعلق، میں تم کو جواب دوں گا"۔

① چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے پوچھا کہ "اہرام مصر کب بنائے گئے"؟ آپ نے کہا، "تو کون سے اہرام کے متعلق دریافت کرتا ہے"؟ کہنے لگا، "حُرمان کے متعلق"۔ حضرت نے فرمایا۔

''اس پر کوئی تصویر بنی ہوگی وہ کیا ہے''؟ اس نے کہا، ''ایک گدھ کی تصویر ہے جس کے منہ میں کیکڑا ہے''۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا، یہی اس کی تعمیر کی تاریخ ہے''۔ بُنِیَ الْحِرْمَانُ النَّصْرُ فِي السَّرْطَانِ (حُرمان اس وقت بنایا گیا جب ستارہ نصر برج سرطان میں تھا)۔اس ستارے کا دور آٹھ ہزار سال میں پورا ہوتا ہے اور اب وہ دور پورا کرنے والا ہے۔

۲ ایک شخص نے سورج کی جسامت دریافت کی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے فرمایا، ''نوسو ضرب نوسو فرسخ'' جب یہ مقولہ میں نے سنا تو زمانہ حال کی تحقیقات کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ سورج کے قطر کا اندازہ آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار میل کیا جاتا ہے۔اس حساب سے سورج کا محیط ستائیس لاکھ چودہ ہزار میل ہوتا ہے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ اس سے حساب لگایا تو ۹۰۰x۹۰۰ فرسخ کے چوبیس لاکھ تیس ہزار میل بنتے ہیں مگر کچھ عرصہ بعد ایک کتاب میں دیکھا کہ فرسخ تین میل شرعی کا ہوتا ہے۔اور میل شرعی دو ہزار گز کا۔ایک گز دو ہاتھ یعنی تین فٹ کا۔ دو ہزار گز کے میل کے حساب سے ۹۰۰x۹۰۰ فرسخ کے ستائیس لاکھ اکسٹھ ہزار میل ہوتے ہیں جو تحقیقاتِ جدیدہ کے مطابق ہے۔ ستائیس لاکھ میل پر صرف سینتالیس ہزار میل کا فرق ہے۔ یہ کوئی فرق نہیں۔ اس لئے کہ سائنس دان اپنی بتلائی ہوئی جسامت کو اپنا اندازہ کہتے ہیں۔اس کو صحیح پیمائش نہیں کہتے۔

۳ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے فرمایا ہے، ''آفتاب کے ۳۶۰ مشرق اور ۳۶۰ مغرب ہیں''۔ اس راز سے تیرہ سو سال قبل کون واقف تھا۔ ہر روز آفتاب کا مشرق ومغرب بدلتا رہتا ہے اور سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔شمالی کرہ میں ۲۱ جون سب سے بڑا دن ہے اور ۲۱ جون سے ۲۵ جون تک شب و روز میں فرق نہیں ہوتا۔لہٰذا معلوم ہوا کہ پانچ دن مشرق ومغرب نہیں بدلتے۔پس پورے سال میں ۳۶۰ مشرق اور ۳۶۰ مغرب ہی ہوتے ہیں۔

۴ تخلیقِ نظامِ شمسی کے متعلق جو خطبات ہیں وہ عربی میں ہیں۔اگر ترجمہ کرا کے آپ کے سامنے پیش کروں بھی تو آپ کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ میں نے اپنے مطلب کے مطابق ترجمہ میں کمی

بیشی تو نہیں کر لی ہے۔ آپ خود عربی سمجھ نہیں سکتے۔ تراجم کا پیش کرنا بھی ایسا ہی ہوگا جیسے میں خود کہہ رہا ہوں کہ خلقتِ نظامِ شمسی کے متعلق جو کچھ خطبوں میں بیان کیا گیا ہے موجودہ سائنسی تحقیقات اس سے آگے نہیں بڑھی ہیں۔ اگر آپ چاہیں گے تو مترجم خطبات کہیں سے حاصل کر کے آپ کو دکھلا دوں گا۔ تاکہ ان سے قول کی تصدیق ہو جائے۔

ان حالات میں یہ تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مہا گیانی (عارف کامل) ہی ایسی خبریں دے سکتا ہے۔ پس جب ایسا شخص یہ کہتا ہو کہ یہ علوم اس کو قرآن ہی سے ملے ہیں اور یہ کہ قرآن میں تمام علوم موجود ہیں تو لامحالہ ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن میں تمام علوم موجود ہیں۔ تب ہی تو ایسا صاحبِ معرفت اس امر کا مدعی ہے۔

آپ کے سوال کا دوسرا جُز یہ ہے کہ اگر قرآن میں تمام علوم ہیں تو وہ بتلائے کیوں نہیں گئے جن سے مسلمان دنیا میں سربلند رہتے اور اہل مغرب ان سے بازی نہ لے جاتے۔ اس کا جواب تو آپ کے سوال کے پہلے جُز کے جواب کی بہ نسبت بدرجہا سہل ہے۔ جس کا معقول اور مثبت جواب مجھ جیسا جاہل بھی دے سکتا ہے۔

دیکھئے پہلے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ اس دنیا کا ہر شخص جتنے بھی علوم وفنون حاصل کرتا ہے جو پیشہ بھی اختیار کرتا ہے۔ دنیا کے کاروبار میں مشقتیں جھیلتا ہے۔ اس کا مقصدِ منتہیٰ کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ مال و دولت حاصل کر کے اپنے کو اس قابل بنالوں کہ اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کرسکوں اور پریشانی واضطرار سے محفوظ رہوں اور سکون واطمینانِ قلب حاصل ہو جائے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ فزکس، کیمسٹری، جیالوجی، باٹنی وغیرہ وغیرہ تمام مروجہ علوم میں سے کسی ایک یا چند علوم میں یا مروجہ فنون میں سے کسی ایک یا چند فنون میں مہارت نامہ حاصل کرنے کے بعد دولت کثیر جمع کر لینے پر کیا اطمینانِ قلب (Peace of Mind) کسی کو میسر آسکتا ہے؟ نہیں۔

ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تفکرات ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ دولت جمع ہوتی جاتی ہے اتنے

ہی تفکرات بڑھتے جاتے ہیں اور اطمینانِ قلب سے فرد دُور ہوتا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ ہی میں جہاں دولت کی ریل پیل ہے، خودکشی کے واقعات دیگر ممالک کی بہ نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد تو یہ تھا کہ بنی نوع انسان کو اطمینانِ[1] قلب کی دولت سے مالا مال کردیں، جو علوم وفنونِ مادی اور دولتِ کثیر کے انبار حتیٰ کہ بادشاہت سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اطمینانِ قلب تو فطرت کے اُن قوانین پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے جن کا تعلق نفسِ انسان سے ہے۔

لہٰذا رحمۃ للعالمین نے قرآنِ کریم میں سے صرف وہی اصولِ فطرت لوگوں کو تعلیم کئے جن سے یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوسکے اور ان قوانین پر عمل کرنے کے لئے یکسوئی ذہنی لازم ہے۔ علومِ مادی محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں، اور نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محسوسات کی طرف ہی راغب ہوتا ہے۔ غیر محسوس اور غیر مرئی عالم (Invisible world) کی طرف توجہ کرنا اس کے لئے نہایت دشوار ہے۔ اپنے باطن کی طرف توجہ کرنا اس کے لئے بہت ہی مشکل ہے۔ پس اگر کچھ علومِ مادی ظاہر کردیئے جاتے تو نفوسِ انسانی کی تمامتر توجہ ظاہری علوم کی طرف ہوجاتی اور ایک فرد بھی اطمینانِ قلب کی نعمت سے سرفراز نہ ہوسکتا۔

یہ تو ایک سبب ہوا۔ اب ان علوم کے نہ بتلائے جانے کا دوسرا سبب سنئے۔
علومِ مادی کی ترقی سے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں۔ تباہ کن اسلحہ تیار کئے جاتے ہیں۔
آدمیوں کے ہاتھوں میں دوسرے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے اور غلام بنانے کی طاقت
بڑھتی ہے۔ انسانیت کی تباہی کے سامان بڑھتے جاتے ہیں۔ دنیائے سائنس کا حال

---

[1] اسلام اطمینانِ قلب عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے جیسا کہ ارشادِ رب العزت ہے:۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؀۲۸ (ایمان والوں کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوجاتے ہیں۔ آگاہ ہو۔ اللہ کی یاد ہی سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے)۔

مشاہدہ کرلیں۔ایک سائنس دان نے لکھا تھا:۔

”ہم بڑی محنت و مشقت سے ایک نامعلوم کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ معلوم ہوجاتا ہے تو دس (۱۰) نامعلوم سامنے آجاتے ہیں تب ان کے معلوم کرنے میں منہمک ہوجاتے ہیں۔جتنی معلومات بڑھتی جاتی ہیں، تباہی و بربادی کے سامان زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔انسان اب ہوا میں اُڑنے لگا تو اس کے لئے وسیع کرۂ ارض پر کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ رہی۔ اب اس پر آسمان سے آگ برسنے لگی“۔

انسان چونکہ بندۂ جذبات ہے لہٰذا وہ اپنی تمام تر قوت وطاقت اپنے جذبات کی تسکین کے لئے صرف کرتا ہے۔ اگر جذبات عقلِ فطری سے مغلوب ہوجائیں تو زمین پر فساد نہ پھیلے۔مگر دنیا کا ہر شخص جانتا ہے اور اس امر کا مشاہدہ کرتا ہے کہ جس قوم کو مادی طاقت حاصل ہوتی ہے وہ اس کو دوسری کمزور قوموں کو غلام بنانے، ان کے حقوق غصب کرنے اور ضعیف اقوام پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔

اس لئے ضروری ہے اور عقل بھی حکم کرتی ہے کہ ایسی طاقتیں کسی فرد کو بھی اس وقت تک نہ دی جائیں جب تک اس میں یہ اہلیت پیدا نہ ہوجائے کہ ان طاقتوں کو کسی حال میں بھی بے جا استعمال نہ کرسکے۔

کیا آپ بچہ کے ہاتھ میں چھری یا پستول دے دیں گے؟ ہرگز نہیں۔ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ ہی کو ہلاک کرلے۔اس لئے ضروری تھا کہ مادی علوم ظاہر نہ کئے جائیں تاکہ زمین پر فساد نہ پھیلے اور ظلم و تعدی کا طوفان نہ اٹھے۔

تیسرا سبب جس کی وجہ سے علومِ مادی کا اظہار انسانیت کے لئے مضر تھا۔ یہ ہے کہ رسولِ کریمؐ کی

بعثت کا مقصدِ وحید تو تزکیہ نفسِ مخلوق[1] ہے۔ لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ تو یہ تھا کہ لوگوں کو گیان (معرفت) حاصل کرنے کے طریقے بتلائیں۔ یہ بات تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ جو طاقتیں گیان سے حاصل ہوتی ہیں ان کے مقابل مادی طاقتوں کی کچھ وقعت نہیں۔

صرف ایک مثال ہی دیکھ لیں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمت اللہ علیہ ایک کمبل اوڑھے ہندوستان تشریف لائے اور راجاؤں کی فوجیں اپنی ساری قوتوں کے باوجود اس جگہ سے ان کو نہ ہٹا سکیں جہاں انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنی اس عظیم روحانی طاقت سے ملک و مال پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام قوتوں کو خلق اللہ کی خدمت و فائدہ رسانی پر صرف کیا۔ نسل و قوم و مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر ہر ایک کو فائدہ پہنچانے میں مصروف رہے مگر کیا بادشاہ و امراء جن کو ہوائے نفس پر غلبہ حاصل نہ ہوا ہو ایسا عمل کر سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

آپ کی قوم کو (اہل ہنود کو) اگر کچھ غم و غصہ ہو سکتا ہے تو ان بادشاہوں کے خلاف جو مال و دولت لوٹتے آتے تھے مگر ان فقراء و درویش صاحبان کو تو ہندوستان کا کوئی شخص بھی خواہ کسی قوم و مذہب کا ہو بھلائی سے ہی یاد کرے گا۔

گیانی کو یہ روحانی طاقتیں اُسی وقت حاصل ہوتی ہیں جب اُس کے خواہشات و جذبات عقلِ فطری سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ احساسِ فریضہ فطری پیدا ہو جاتا ہے اور کسی قوت کو بے جا استعمال کرنے کی اہلیت باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا لازمی اور ضروری تھا کہ مادی علوم کی طرف لوگوں کو متوجہ نہ کیا جائے۔

اس وقت مجھے سوامی دیانند سرسوتی جی یاد آ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو قوم پر انہوں

---

[1] جیسا کہ ارشادِ باری ہے:- هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲) (وہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس نے اہلِ مکہ میں ان میں سے ایک رسول بھیجا تا کہ ان پر اس کی آیات تلاوت کرے اور ان کا تزکیہ کرے اور انہیں علم و حکمت سکھائے۔

نے بہت بڑا احسان کیا۔قومیت کا جذبہ بیدار کیا۔ بُت پرستی سے روکا۔شدہی سے غیر اقوام کے ہندو دھرم میں داخل ہونے کا دروازہ کھولا۔مگر سناتن دہرم کوسخت نقصان بھی پہنچا گئے کہ ایک انادی (قدیم) کے بجائے تین انادی بنا گئے ۔چونکہ وہ مادی سائنس کی اس وقت کی مسلمہ تھیوری (نظریہ) سے مرعوب تھے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا بلکہ اشکال بدلتا رہتا ہے۔لہٰذا انہوں نے مادہ، روح، خدا تین اَنادی (قدیم) بنا ڈالے۔

اگر وہ گیانی ہوتے تو ایسا کام کرنا ممکن نہ تھا۔اب ان کا قائم کردہ وہ دین باطل ہوگیا اور دنیا پر ظاہر ہوگیا اور یہ نظریہ دنیا کے سامنے آ گیا کہ مادہ حادث ہے۔وہ چونکہ گیانی نہ تھے تو کہتے تھے کہ انبیاء اوراوتار ہمیں کیا دے گئے؟ یہ تو معرفت ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمیں ایسی نعمتیں دے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے انسان مادے کا محتاج نہیں رہتا اور پرم آتما کی صفات اس میں جھلکنے لگتی ہیں۔

کیوں پنڈت جی انصاف سے بتلائیں کہ میں نے جو کچھ عرض کیا،عقل وفطرت کے مطابق ہے یا نہیں؟ پنڈت جی نے کہا کہ:۔

’’ہاں بیانات تو معقول ہیں مگر چونکہ یہ مسئلہ آپ کے عقائد سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس میں کسی کو دخل دینا نہیں چاہئے۔ اس لئے میں اپنا اعتراض واپس لیتا ہوں۔ اب میں ایک سوال اور دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ میرا آخری سوال ہوگا‘‘۔

بندہ نے کہا وہ سوال بھی کر ڈالئے۔کوئی شبہ اور وسوسہ آپ کے دل میں نہ رہ جائے۔

چھٹے اعتراض کو نقل کرنے سے قبل چند نکات برائے معلومات

ناظرین کی خدمت میں التماس ہے کہ پنڈت جی کا چھٹا سوال تو بعد میں نقل کروں گا پہلے اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے ایسی معلومات میں سے کچھ پیش کردوں جو مجھے اس واقعہ کے بعد قرآن وحدیث سے حاصل ہوئیں۔ان کے منجملہ چند نکات پیش کرتا ہوں۔

۱۹۳۷ء۔ ۳۸ء میں مَیں میرنشاہ میں تعینات تھا۔ایک روز ایئر فورس آفس کی طرف گیا۔

واپسی پر میں نے دیکھا کہ گولہ باری کی مشق کے لئے ہوائی جہاز اڑائے جا رہے ہیں۔ وہاں کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ واپس آ کر عصر کے بعد تلاوت کے لئے کلام اللہ کھولا تو سورۂ والذاریات سامنے تھی۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ① فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ② فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ③ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ④ ذاریات

قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد و غبار اڑاتی ہیں پھر بوجھ اٹھا لینے والی کی۔ پھر آہستہ آہستہ چلنے والیوں کی۔ پھر تقسیم کار کرنے والیوں کی۔

اب بغیر کسی تاویل کے دیکھیں کہ یہ طیارے کی تصویر ہے یا نہیں۔ میں تو یہ منظر دیکھے ہوئے آیا تھا کہ پہلے تند و تیز ہوا چلتی ہے گرد اڑاتی۔ پھر وہ بوجھ کو اٹھا لیتی ہے۔ پھر بوجھ کو لے کر آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ پھر جس مقصد کے لئے یہ کام ہوئے، اسی امر کی تقسیم کار کرتی ہے کہ وہ امر پورا ہوتا ہے۔

سورۂ ملک میں ارشاد ہے:۔

هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ② الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ③ الملک

اور وہ (سب پر) غالب اور بخشنے والا ہے جس نے تہ بتہ سات آسمان خلق کئے۔

پھر ان تہ بتہ آسمانوں کی شرح بھی بیان فرما دی۔ دیکھیں سورۂ مومنون پ۔۱۸ ع۔۱ میں ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ⑰ المومنون

ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں۔

سائنس کی تحقیقِ جدید سے معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کے اوپر چھ سیاروں کے مدار ہیں اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ زمین کے اوپر سب سے پہلا راستہ یا مدار چاند کا ہے۔ لہٰذا ہماری زمین کے اوپر ایک راستہ چاند کا ہے اور زمین کے مدار پر چھ سیاروں کے مدار یا راستے ہیں۔ یہ سات راستے تہ بتہ ہمارے اوپر خالق کائنات نے خلق فرمائے ہیں۔ یہ تہ بتہ سات آسمان ہیں۔ سبحان اللہ۔

سورۂ نمل آخری رکوع دیکھیں۔ ارشاد رب العزت ہے:۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ط صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ﴿۸۸﴾ النمل

تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور گمان کرتا ہے ان کو ٹھہرا ہوا حالانکہ وہ چل رہے ہیں چلنا بادل کا۔ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو مضبوط بنایا۔

مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:۔

''اور تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اُن کو جما ہوا مضبوط سمجھتا ہے حالانکہ وہ (قیامت میں) اڑتے ہوں گے اڑنا بادل کا۔ یہ خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر شے کو مضبوط بنایا''۔

اس ترجمہ کی غلطی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ قیامت کا تذکرہ نہیں ہوسکتا۔ قیامت میں تو تباہی ہوگی۔ یہاں خدا کی صنعت کا ذکر ہے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ سطح ارض سے بلندی پر بادل جب حرکت کرتا ہے، وہ سطح زمین کی گولائی کے متوازی ہی چلتا ہے اور آیت میں پہاڑوں کے چلنے کو بادل کی چال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت زمین کی اپنے محور کے گرد حرکت کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ﴿۶﴾ الشمس　(قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے اس کو لڑھکایا)۔

یہ آیت صاف ہے کہ وہ زمین کی اپنے مدار پر سورج کے گرد حرکت کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

اب صرف ایک اور آیت پیش کرتا ہوں۔ سورۂ نور کا پانچواں رکوع ملاحظہ کریں۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ لا يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ﴿۳۵﴾ النور

اس کے نور کی مثال (یعنی وہ نور جو اوّل مخلوق ہے) ایسی ہے جیسے ایک قندیل ہو۔ اس میں چراغ ہو چراغ شیشہ کے فانوس میں ہو، وہ فانوس ایسا ہو جیسا چمکتا ستارہ، روشن ہوتا ہے شجر مبارکہ زیتونی سے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ قریب ہے کہ تیل اس کا روشن ہو جائے۔ جب کہ آگ اس سے مس نہ ہوئی ہو۔

اس آیہ وافی ہدایہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بجلی کے بلب کی تصویر ہے۔ کسی تاویل کے بغیر صرف لفظی ترجمہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برق کا ذکر ہے۔ مشکوٰۃ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں چراغ رکھا جائے بجلی کا بلب شیڈ میں رکھا جاتا ہے۔ اس میں چراغ (روشن ہونے والا تار) ہوتا ہے اور چراغ شیشہ کے فانوس یعنی بلب میں ہوتا ہے۔ وہ شیشہ کا فانوس یعنی بلب روشن ستارے کی مثل چمکتا ہے۔ بغیر آگ سے مس ہوئے روشن ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ عما یصفون۔

اب صرف دو احادیث اور پیش کر دوں پھر اصل مقصد کی طرف رجوع کروں گا۔

جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

① **خلقت الارض علی راس الثور** (زمین بیل کے سینگھوں پر خلق کی گئی)۔

بیل کے سینگھوں کی شکل دیکھ لیں کہ وہ گول شکل پر ہوتے ہیں جو اوپر نیچے سے چپٹی ہوتی ہے۔ یہی زمین کی شکل ہے کہ وہ ایک گول گیند ہے جس کے شمالی اور جنوبی سرے چپٹے ہیں۔

اس حدیث سے لوگوں نے یہ مطلب لے لیا کہ کرۂ زمین گائے کے سینگ پر رکھا ہوا ہے حالانکہ حدیث سے مطلب یہ ہے کہ زمین بیل کے سینگوں کی شکل پر بنائی گئی ہے۔ حدیث میں یہ تو نہیں ہے کہ بیل کے سینگ پر رکھی ہوئی ہے۔

② **خلقت الارض علی السمك** (زمین مچھلی (کی) شکل پر خلق کی گئی ہے)۔

اب ذرا زمین کے مدار (Orbit) پر اس کی تصویر دیکھ لیں کہ آفتاب کی مخالف سمت میں جو زمین کا سایہ پڑتا ہے تو بالکل مچھلی کی شکل نظر آتی ہے۔ زمین کے اس سایہ کو ''قاف'' کہتے ہیں۔

ان دونوں حدیثوں سے عوام الناس میں یہ تخیل قائم ہو گیا تھا کہ زمین گائے کے سینگ پر ٹکی ہوئی ہے۔ گائے مچھلی پر کھڑی ہے۔ مچھلی پانی پر ہے اور پانی ہوا پر ٹھہرا ہوا ہے۔ گائے کا ایک سینگ جب تھک جاتا ہے تو دوسرا بدلنا چاہتی ہے۔ اس وقت زلزلہ آ جاتا ہے۔

ایک واقعہ اسکول کے زمانہ کا یاد آ گیا۔ اس وقت میں دسویں درجہ میں تھا۔ ایک روز سورۂ یٰسین

تلاوت کرر ہا تھا۔ جب اس آیت پر پہنچا۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾ یٰسین

پاک ہے وہ ذات جس نے جوڑے پیدا کئے، ان تمام چیزوں میں سے جو زمین سے اگتی ہیں اور خود ان کے نفسوں میں سے اور ان میں جن کو وہ نہیں جانتے۔

میرے ایک بزرگ عزیز فقیہ تھے۔ ان کے پاس گیا اور یہ آیت ان کو سنا کر عرض کیا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نباتات میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ اس پر انہوں نے سخت طرح جھڑکا اور فرمایا ''تفسیر بالرائے کفر ہے''۔ پھر ایک تفسیر نکال کر دکھلایا کہ جوڑوں سے مراد ''مختلف اور مقابل قسمیں ہیں۔ رنگ برنگ کے پھول سرخ، سبز، زرد، گلابی وغیرہ'' میں مرعوب ہو گیا۔ پھر یہ خیال ذہن سے اتر گیا۔ تقریباً تیس سال بعد جب بغور تلاوت کرنے لگا تو اس کی تائید میں دوسری نظر آئی:۔

وَ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۹﴾ زاریات

اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا تا کہ تم نصیحت پکڑو۔

علم نباتات (Botony) نے ثابت کر دیا ہے کہ نباتات میں بھی نر و مادہ ہیں۔ کھجور اور پپیتہ کو تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ بعض درخت نر ہوتے ہیں۔ بعض مادہ۔ بعض پھول نر ہوتے ہیں بعض مادہ۔ بعض پھولوں میں ایک پھول میں ہی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ یہ بات کلام پاک نے تیرہ سو سال پہلے ہی واضح کر دی تھی۔

اب اصل مقصد کی طرف یعنی پنڈت جی کے سوالات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

سوال　چھٹا اعتراض　(نماز سے قوائے باطنی کی ترقی ممکن نہیں)

چند دن خاموش رہنے کے بعد ایک روز پنڈت جی نے اپنا آخری سوال پیش کیا۔ کہنے لگے کہ:۔

''مذہب کا مقصد انسان کے قوائے باطنی کو ترقی دینا ہے۔ کسی مذہب کو قبول

کرنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ انسان اس پر عمل کرکے قوائے باطنی کا کمال حاصل کر سکے۔ اگر یہی نہ ہوسکا اور مذہب نے اس طرف رہنمائی نہ کی تو وہ دین بے کار اور فضول ہے۔

قانون فطرت ہے کہ نفس کے قوائے باطنی کی ترقی یکسوئی توجہ مراقبہ یعنی دھیان لگانے سے ہوتی ہے۔ جب ایک جگہ بیٹھ کر کسی ایک مرکز کی طرف توجہ کرنے کی مشق کرتے ہیں تو روز بروز قوت توجہ بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے۔ جہاں خیال بٹانے والی کوئی چیز نہ ہو۔ نشست کا طریقہ بھی ایسا ہو کہ کسی عضو کے وزن کو سہارا دینے کی ضرورت نہ ہو اور اس کو کسی خاص حالت میں رکھنے کی طرف توجہ نہ کرنی پڑے ورنہ وہی نفس کے لئے باعث مشغلہ ہو کر توجہ میں مخل ہوگا۔ اور جب یکسوئی ذہنی قائم نہ رہ سکے تو باطنی قوتوں کی ترقی ممکن نہیں۔

سناتن دھرم اور بدھ مت نے تو ایسی بہت سی ریاضتیں اور عبادتیں بتلائیں ہیں جن سے گیان حاصل ہو سکے بلکہ ان مذاہب کی تو بنیاد ہی گیان، دھیان اور بھگتی پر ہے۔

جب ہم اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز اس کی افضل ترین عبادت ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولاً پرسش نماز بود

اکثر مسلمان دوستوں سے سنا ہے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ:۔

''نماز دین کا ستون ہے اگر وہ قبول ہوئی تو اور اعمال بھی قبول ہوتے ہوتے ہیں اور اگر وہ رد کر دی گئی تو اور اعمال بھی رد کر دیئے جاتے ہیں''۔

گویا کہ یہی وہ عبادت ہے جو تمام دیگر اعمال و عبادات کی روح اور ان کی بنیاد ہے۔ اب اگر آزادانہ طور پر ہم نماز پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں مختلف حرکات و سکنات کرنے پڑتے ہیں وہ بھی خاموشی سے نہیں بلکہ کچھ پڑھنے کے ساتھ۔ غرض یہ کہ نماز تو تمام کی تمام اختلافِ حرکات اور تبدیلئ خیالات پر مشتمل ہے اور جب خیال تبدیل ہوتا رہے تو یکسوئی ذہنی ممکن نہیں۔ پھر جب یکسوئی توجہ نہ ہو تو کمالاتِ نفسانی حاصل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا نماز سے قوائے باطنی کی ترقی ممکن نہیں۔ پس جو عبادت قوائے باطنی کی ترقی کی طرف بڑھانے والی نہ ہو بے فائدہ ہے۔

جب اسلام کی افضل ترین عبادت کا یہ حال ہو تو مذہبِ اسلام گیان اور صفائے باطن کی طرف کس طرح راہ دکھلا سکتا ہے۔ پھر جب یہ فائدہ بھی نہ ہو تو ایسے مذہب سے کیا فیض حاصل ہو سکتا ہے؟''

الجواب بعون الوہاب

بندہ نے کہا۔ کسی چیز پر ظاہری نظر ڈالنے سے اس کے عیب و صواب کا نظر آنا محال ہے لہٰذا جو لوگ اعمال و عقائد اسلام کو سرسری اور ظاہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حقائق کی طرف توجہ دلانے والا موجود ہو اور وہ جو کچھ بتلائے۔ اس پر غور و فکر کریں تو البتہ محاسن نظر آ سکتے ہیں۔

دیکھئے جب یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کسی مذہب کی حقانیت کی پہچان یہ ہے کہ وہ قوائے باطنی کی تکمیل کے طریقے سکھلائے تو ہر وہ دین جو ایسی تعلیم دے دین حقہ ہے مگر ایسے تمام ادیان میں ہم کیسے معلوم کریں کہ ان میں کونسا دین حق ہے۔ جس کو دوسرے ادیان پر ترجیح دینی چاہئے۔

بعض ادیان تو ایسے مشکل اور ناقابل عمل طریقے بتاتے ہیں جن پر ہر شخص عمل نہیں کر سکتا بلکہ صرف چند افراد ہی ان پر عامل ہو سکتے ہیں اور ایک مذہب ایسے سہل و آسان طریقے سکھلاتا ہے جن پر

چل کر اکثر افراد کمالاتِ نفسانی حاصل کر سکیں تو وہ ہی دین لائق ترجیح ہوگا۔ جو شخص اس راستہ کو اختیار نہ کرے گا، گھاٹے میں رہے گا۔

دیکھئے ہر صاحب فہم جانتا ہے کہ کمالات قوائے باطنی اور صفائے قلب یکسوئی ذہنی اور توجہ الی اللہ سے حاصل ہوتے ہیں تو جو شخص روزانہ کچھ وقت اس پر صرف کرے وہ حصول کمالات میں اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جو تمام دن اسی حالت میں گزار دے۔

یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ پس جو شخص تمام دن توجہ الی اللہ میں گزارے گا۔ وہ منزلِ کمال کی طرف تیزی سے بڑھے گا اور حصولِ کمالاتِ باطن میں ان لوگوں پر سبقت لے جائے گا جو چند گھنٹے روزانہ ریاضت کرتے ہوں۔

اب یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کونسا مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں کو ہر وقت ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ میں مصروف رہنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام ہی وہ دین واحد ہے جس نے اپنے تابعین کو ہر وقت یادِ خدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ کلام اللہ میں بہ کثرت آیات ایسی ہیں جن میں حکم ہے۔ اللہ کی یاد[1] بہ کثرت کرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ کہیں حکم ہے مجھے اٹھتے بیٹھتے یاد کرو[2] نماز جمعہ[3] کے لئے حکم ہے۔ ''جب نماز ختم ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبار میں مصروف ہوجاؤ) اور اللہ کا ذکر بہ کثرت کرتے رہو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو''۔

غرض یہ کہ اسی طرح کی بہت سی آیات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جن سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ بندہ ہر وقت، ہر دم و ہر لحظہ اور ہر حال میں مالک کا ذکر کرتا رہے

اور کسی وقت بھی اس کی یاد سے غافل نہ ہو۔

ہر اس شخص کے لئے جو کمالاتِ باطنی کا خواستگار ہو۔ عقل تو یہی حکم دے گی کہ ہر وقت مالک کی یاد میں مصروف رہے۔ روز وشب اس کی یاد میں گزارے تاکہ منازلِ کمال کی طرف قدم بڑھا سکے۔

اب ہر شخص یہ کہے گا کہ یہ تو دنیا کے کام کاج چھوڑے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے فقرأ، سادھو اور اولیاء اللہ دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو کر ریاضتیں کرتے تھے۔ تب ہی ان کو کمالاتِ باطنی حاصل ہوتے تھے۔ قریب قریب تمام مذاہبِ عالم میں عوام الناس ان ہی لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو تارک الدنیا ہو کر گوشہ نشینی میں ہر وقت مالک کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ وہی اولیاء اللہ اور محبّانِ خدا سمجھے جاتے ہیں۔

تارک الدنیا اشخاص میں کچھ نہ کچھ کمالاتِ نفسانی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اہلِ دنیا کا ان کی طرف رجوع کرنا، ان کو ولی اللہ سمجھنا ناگزیر ہے مگر اسلام نے ترکِ دنیا کی ممانعت کی ہے اور رسولِ اسلامؐ نے فرمایا ہے:۔

لا رھبانیۃ فی الاسلام (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے)۔

پس جو شخص دنیا سے منہ موڑ کر زندگانی دنیا کو چھوڑ کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ رہے۔ اس نے گویا اسلام سے منہ پھیر لیا۔ اسلام کی رو سے رہبانیت اچھا عمل نہیں ہے مگر عوام الناس اس کو بہت اچھا کام سمجھتے ہیں۔ اگر عقل وفطرت کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے گا کہ رہبانیت باوجودیکہ اس سے کچھ کمالاتِ نفسانی حاصل ہو جاتے ہیں ممدوح نہیں ہے بلکہ مالک کی مرضی کے خلاف ہے۔

جناب کو یہ خیال تو ضرور آئے گا کہ بھلا ایسی کونسی کسوٹی ہوگی جس پر اس عمل کو پرکھا جاسکے اور اس کو غیر ممدوح ثابت کیا جاسکے؟ مگر کمترین عرض کرتا ہے کہ آپ مشوّش نہ ہوں۔ ہر عمل کی برائی اور بھلائی تمیز کرنے کا سہل ترین طریقہ آپ کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں۔

دیکھئے اگر کوئی عمل ایک شخص کے لئے اچھا ہے تو دنیا کے ہر مرد وزن کے لئے اس پر عمل کرنا مفید

ہی ہوگا اور اگر ایک کام کسی ایک شخص کے لئے بُرا ہے تو ہر شخص کے لئے اس پر عمل کرنا بُرا ہی ہوگا۔ اب رہبانیت کو اسی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں۔ اگر باطنی قوتوں کے کمالات حاصل کرنے کے لئے کاروبار دنیا کو ترک کر کے گوشہ تنہائی میں جا گزیں ہو جانا مرضیٔ خالق کے مطابق ہے اور اس سے مالک کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے تو ہر شخص پر لازم ہوگا کہ کاروبار دنیاوی سے منہ موڑ کر دنیا و مافیہا کو چھوڑ کر صحرائے لق و دق یا کسی غار میں جا بیٹھے اور تنہائی میں زندگی گزارے۔

اب غور کریں اور سوچیں کہ اگر دنیا کا ہر مرد و زن رہبانیت اختیار کر لے تو کیا دنیا ویران نہ ہو جائے گی اور بہت قلیل مدت میں روئے زمین پر کیا ایک متنفس بھی باقی رہ جائے گا؟

اب تو واضح ہو گیا کہ رہبانیت رضائے خالق کے منافی۔ اس کی مرضی کے خلاف ہے اور اس پر عمل کر کے کوئی شخص خوشنودی خالق حاصل نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ ایسا شخص کچھ کمالاتِ نفسانی حاصل کر کے مرجع خلائق بن جائے مگر اس سے رضائے الٰہی حاصل ہونا ممکن نہیں۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب ہر فردِ بشر پر قوائے باطنی کو ترقی دینا لازم ہے جس کے بغیر خوشنودیٔ خالق حاصل نہیں کر سکتا جس کا واحد ذریعہ **توجہ الی اللہ** میں وقت گزارنا ہے جو گوشہ نشینی کے بغیر ہو نہیں سکتا اور ترکِ دنیا خالق کی مرضی کے خلاف ثابت ہوا تو آخر انسان وہ کونسا طریقہ اختیار کرے جو مالک کی مرضی کے مطابق بھی ہو اور اس سے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل ہو سکیں۔

اس کے لئے خود اپنے نفس کی فطرت کا مطالعہ لازم ہے۔ اپنے روزمرہ کے مشاہدے پر غور کریں۔ آپ روزانہ دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ جب آپ کارخانہ کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف ہوتے ہیں تو میز پر قلمدان، کتابیں، رجسٹر وغیرہ رکھے ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ آپ کی توجہ کا مرکز تو صرف حساب کی رقوم ہوتی ہیں مگر قلم، سیاہی لینے کے لئے ہر مرتبہ دوات ہی میں جاتا ہے حالانکہ آپ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور یہ بھی کبھی نہیں ہوتا کہ آپ کا ہاتھ میز پر رکھی ہوئی کسی چیز سے ٹکرائے۔ ہر چند کہ آپ حساب لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں مگر کچھ نہ کچھ توجہ ماحول کی چیزوں کی طرف بھی ہے۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ نفسِ انسان جس وقت کسی ایک مرکز کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ اپنے ماحول سے کلیتاً غافل نہیں ہوتا بلکہ توجہ کی خفیف شعاعیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی توجہ ماحول کی ہر شے کی طرف رہتی ہے۔ اور یہ بھی قانون فطرت ہے کہ نفس انسان کی جس قوت کو بھی ترقی دینے کی مشق کریں گے وہ برابر بڑھتی چلی جائے گی۔

خوشخطی ہی کو دیکھ لیں۔ ابتداء میں کوئی حرف صحیح لکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر تدریجی مشق سے یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اگر ایک حرف بیس مرتبہ بھی لکھے تو بالکل ایک ہی شکل ہوگی۔ پس جب نفسِ انسان میں تقسیمِ توجہ کی اہلیت موجود ہے کہ وہ ایک مرکز کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور طرف بھی اجمالی توجہ کرسکتا ہے تو اگر تقسیمِ توجہ کی مشق کرائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند سال کی تدریجی اور مسلسل مشق سے یہ اہلیت پیدا نہ ہوجائے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مراکز کی طرف توجہ کرسکے۔

جب خالق نے بندوں کو حکم دیا کہ میری یاد ہر وقت کرتے رہو۔ ہردم و ہر لحظہ میری طرف متوجہ رہو اور میری دنیا کو بھی آباد رکھو۔ پھر یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ممکن تھے۔ مگر وہ فاطرِ فطرت جس نے قوائے ظاہری و باطنی نفسِ انسان میں ودیعت فرمائے ہیں۔ خود ہی خوب جانتا ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ اس سے کس طرح لئے جائیں۔

اس نے اسی واسطے ایمان لانے والے بندوں پر دن میں پانچ وقت کی نماز لازم قرار دی جس میں کھڑا ہونا۔ رکوع کرنا۔ بیٹھنا۔ سجدہ کرنا۔ سورے اور تسبیحات پڑھنا۔ ان کی قرأت و مطالب کی طرف توجہ کرنا اور مالک کی طرف بھی توجہ رکھنا۔ ایک جگہ جمع کردیا۔ تاکہ مومنین کے نفوس کو اس کی مشق کرائی جائے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو ارکان کی طرف بھی توجہ کریں۔ واجبات کی طرف بھی توجہ کریں، مستحبات کی طرف بھی توجہ کریں۔ قرأت کی طرف بھی توجہ کریں اور ہر حال میں مالک کی طرف بھی توجہ کرتے رہیں۔

پس جو نفس روزانہ پانچ مرتبہ تقسیم توجہ کی ایسی مشق کرتا رہے گا تو کیا چند سال میں اس میں اتنی بھی اہلیت پیدا نہ ہوسکے گی کہ ایک وقت میں دو طرف ہی توجہ کرسکے کہ اپنے خالق کی طرف بھی توجہ کرتا

رہے اور ساتھ ہی دنیا کے کاموں کی طرف بھی متوجہ رہ سکے۔

پس جب یہ اہلیت پیدا ہو جائے گی تو دنیا کے کاروبار میں مصروف رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہوگا اور اس طرح قوائے باطنی کے کمالات کے حصول میں جلد کامیاب ہوگا۔

اللہ پاک نے اپنے کلام پاک میں مومنین کاملین کی یہی صفت بیان فرمائی ہے کہ اُن [1] کو معاملات تجارت، کوئی خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی اور سورہ جمعہ میں بھی حکم ہے کہ جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو اور اللہ کی یاد بہ کثرت کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ یعنی کاروبار دنیا میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ رہو۔

اب تو واضح ہو گیا کہ صرف نماز ہی وہ عمل واحد ہے جس سے انسان قوائے باطنی میں ترقی کر کے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل کر سکتا ہے اور مقصدِ خالق کی تکمیل میں بھی مصروف رہ سکتا ہے۔ یعنی خالق کی دنیا کو آباد رکھتے ہوئے، اس کی مخلوق کی خدمت کرتے ہوئے ایمانِ حقیقی یعنی گیان (معرفت) بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جس سے رضائے الٰہی حاصل ہوگی اور نعیمِ اُخروی کا حقدار ہو جائے گا۔ نماز کے سوائے کوئی طریقہ عبادت ایسا نہیں ہو سکتا جس سے کمالاتِ نفسانی بھی حاصل ہو سکیں اور رضائے خالق بھی نصیب ہو۔

اب تو ظاہر ہو گیا کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو حصولِ رضائے خالق کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نماز تمام ادیان کی عبادات سے بہتر ہے۔ اب پنڈت جی کہنے لگے کہ واقعی اگر صحیح طریقہ پر عمل کیا جائے تو نماز صفائے باطن کا بہترین ذریعہ ہے۔

فالحمد للہ رب العٰلمین ○

---

[1] لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور:۳۷)

گھر کا بھیدی

اس واقعہ کے (جو بیان ہو چکا) کافی عرصہ بعد ایک مسلمان جنٹلمین سے ملاقات ہوئی جو ایک بڑی کمپنی میں اورسیر تھے جب ان کے ساتھ نشست و برخاست کا سلسلہ ہوا تو معلوم ہوا کہ صاحبِ موصوف دہریت کے پروپیگنڈے کے زیر اثر مذہب سے بیزار ہیں۔ ایک روز نماز کے متعلق کہنے لگے کہ ''اس اُٹھا بیٹھی سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے''؟

کچھ عرصہ پہلے پنڈت جی سے نماز کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی اس کو اجمالاً بیان کر کے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو تقسیمِ توجہ کی مشق کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ سُن کر ایک قہقہ لگایا اور کہنے لگے کہ:۔

''آپ دین کے معاملہ میں کوئی ذمہ دار حیثیت تو رکھتے نہیں، جو آپ کے قول کو حجت سمجھ لیا جائے۔ اس وقت اسلام میں دو بڑے فرقے ہیں۔ شیعہ اور سنی، ان کی جو ذمہ دار ہستیاں اراکینِ دین سمجھتی ہیں وہ علماء دین ہیں۔ ان حضرات میں سے کسی نے بھی یہ انوکھا خیال جو آپ پیش کر رہے ہیں ظاہر نہیں فرمایا۔ لہٰذا یہ آپ کا ذاتی خیال ہے نہ کہ تعلیمِ اسلام۔ میں نے دونوں فرقوں کی کُتبِ فقہ میں نماز کے مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں کہیں توجہ کا ذکر تک نہیں۔ تمام کتبِ فقہ میں حرکات وسکناتِ ظاہری کا بیان ہے کہ ہاتھ کیسے رکھیں۔ پیر کیسے رکھیں۔ رکوع میں ہاتھ کہاں اور کیسے رکھیں سجدے میں کہاں اور کیسے رکھیں وغیرہ وغیرہ یہ کہیں ذکر نہیں کہ قلب کیسے رکھیں۔ توجہ کیسے کریں۔ پھر بھلا میں آپ کے اس قول کو کیسے مان لوں۔ اس وقت تو میں نماز کے مسائل میں سے کچھ زبانی سنا سکوں گا۔ مگر آپ یقین کیسے کریں گے۔ میرے پاس فقہ کی چند کتابیں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کل یا پرسوں لے آؤں گا اور آپ کو وہ مسائل

دکھلا دوں گا‘‘۔

چنانچہ ایک روز وہ چند کتابیں لے کر آ گئے اور کہنے لگے:

’’دیکھئے پہلے علماء شیعہ کے فتاویٰ دکھلاتا ہوں پھر علماء اہل سنت کے مسائل دکھلاؤں گا۔

یہ ہے رسالہ مفتاح الہدایہ مطبوعہ صادق پریس احاطہ کمال جمال لکھنؤ جو ایک جلیل القدر مجتہد شیعہ کے فتاویٰ کے مطابق ہے یہ دیکھ لیجئے، آخر میں تصدیق بھی ہے اور مہر بھی ثبت ہے۔ صفحہ ۳۳ پر ہے فصل چوتھی ’’قرأت‘‘ میں ساری فصل دیکھ لیں۔ صرف اسی پر زور دیا گیا ہے کہ حرف کا مخارج سے ادا کرنا لازم ہے۔ اس کا سیکھنا بہت ضروری ہے۔ مفہوم و معانی کے سمجھنے کا کہیں ذکر تک نہیں۔

دوسرا رسالہ یہ ہے ’’نخبہ ونجات العباد‘‘ مطبوعہ مطبع تصویر عالم ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ۔ یہ ایک رسالہ کا ترجمہ ہے جو عراق کے مجتہد اعلم کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔ صفحہ ۶۱ دیکھیں۔ چوتھا باب قرأت میں شروع ہوتا ہے۔ اس میں کہیں مطالب و مفاہیم کا ذکر نہیں۔ صفحہ ۶۲ پر ہے۔ اگر سورہ پڑھنے میں کوئی کلمہ رہ جائے اور بعد کو یاد آئے تو صرف وہی کلمہ پڑھ لیں۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اس میں سمجھنے کا کہیں ذکر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص **الحمد للہ العالمین** پڑھ گیا اور سورہ پڑھنے کے بعد یاد آئے تو ’’رَبِّ لِ‘‘ کہہ لے نماز پوری ہو جائے گی۔

اور یہ دیکھیں رسالہ مفتاح الہدایہ صفحہ ۳۷ ’’مبطلات نماز‘‘ چوتھے بات کرنا بغیر قرآن ...... یہ بات کرنا عمداً مبطل نماز ہے۔ سہواً بات کی تو مبطل نماز نہیں۔ پانچویں قہقہ۔ یہ مبطل نماز ہے عمداً وقہراً۔ اگر نماز سے غافل ہو کر ہنسے تو مبطل نماز نہیں۔ چھٹے رونا واسطے امورِ دنیا کے......اور اگر حالتِ غفلت میں نماز میں روئے تو

ضرر نہیں رکھتا۔

اب علماء اہل سنت کی کتب ملاحظہ فرمائیں۔ یہ ہے ''منیۃ المصلی'' باترجمہ فارسی مطبوعہ صابر الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور۔ یہ کتاب علماء متقدمین ومتاخرین کے فتاویٰ کی تلخیص ہے۔تمام کتاب دیکھ جائیں۔کہیں توجہ کا ذکر نہیں۔صفحہ ۲۰۱ پہ فصل مایفسہ الصلوٰۃ شروع ہوتی ہے۔

صفحہ۔۳۰۱: اگر کلام کیا لوگوں کی باتوں سے بھول کر یا عمداً فاسد ہوتی ہے نماز مگر شرط یہ ہے کہ اتنی آواز سے ہو کہ اپنے کان میں آواز پڑتی ہو۔

صفحہ۔۳۰۶: اگر کسی کے ہاتھ میں تیل ہو اور سر کو ملے فاسد نہیں ہوتی (نماز)

صفحہ۔۳۱۱: اگر کوئی شعر انشا کیا یا خطبہ انشا کیا اور زبان سے کلام نہ کیا نماز فاسد نہیں ہوتی۔

صفحہ۔۳۱۳: اگر مارے جوئیں چند بار پس اگر ماریں پے در پے نماز فاسد ہوگی۔اگر مارنے کے درمیان وقفہ ہے تو فاسد نہیں ہوتی۔

صفحہ۔۳۰۷: اگر عمامہ سر سے اتارے اور زمین پر رکھے یا زمین سے اٹھا کر سر پر رکھے یا قمیض اتارے یا ایک ہاتھ سے عمامہ باندھے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

اب یہ کتاب مالا بدعنہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ کتاب تو اتنی مشہور ہے کہ ہر مسلمان اس کے نام سے واقف ہے۔اس میں بھی ایسے ہی مسائل ہیں''۔

غرض یہ کہ ان کتب سے بہت سے مضحکہ خیز مسائل دکھلاتے رہے جن کو میں تحریر میں لانا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ مسائل دکھلانے کے بعد کہنے لگے کہ:

''اب بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ آپ کے فقہائے کرام ومجتہدین عظام کے فتاویٰ سے جو ارا کین دین وحامیان شرع متین ہیں۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز میں یکسوئی توجہ کی ضرورت نہیں اور آپ توجہ کا راگ الاپ رہے ہیں۔ پھر جب آپ عالم ہیں نہ

فقیہ اور نہ دین میں کوئی ذمہ دار حیثیت رکھتے ہیں تو مستند علماء کرام کے فتاویٰ کے مقابل آپ کی رائے اور قیاس کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ تمام کتبِ فقہ دیکھنے سے جملہ مسائل کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

① نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کا مفہوم سمجھنا ضروری نہیں ہے۔

② نماز میں یکسوئی توجہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ہاتھ سے کوئی بھی کام کر لیں۔ نماز فاسد نہیں ہوتی۔ عمامہ باندھ لیں، جوئیں مار لیں، شعر انشا کر لیں، خطبہ انشا کر لیں، نماز سے غافل ہو کر ہنس لیں، رو لیں نماز درست ہی رہے گی۔

③ بس با قاعدہ اٹھا بیٹھی کرنے سے اللہ پاک راضی اور خوش ہو جاتے ہیں۔

④ ایک مولوی صاحب نے وعظ میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ نماز کو فرشتے عرش الٰہی پر لے جاتے ہیں اور اللہ پاک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر قبول ہوئی تو عرش پر رکھ لی جاتی ہے ورنہ حکم ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے منہ پر مار دو، اور وہ نمازی کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔

اب بتلائیے کہ ایک صاحب فہم کے لئے یہ باتیں بھلا کیسے قابل قبول ہو سکتی ہیں''۔

الجواب بعون الوہاب

بندہ نے کہا آپ کے اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ اس لئے کہ تمام اعتراضات کی بنیاد فقہاء کے اقوال پر ہے۔ وہ خدا اور رسولؐ کے اقوال نہیں ہیں۔ یہ سن کر قہقہہ لگایا اور بولے:

''یہ تو آپ جان بچا کر خوب بھاگے۔ جب کچھ جواب بن نہ پڑا تو علماء دین سے ہی منکر ہو گئے۔ یہ بہت اچھی راہ فرار اختیار کی''۔

میں نے کہا جناب میں علماء و فقہاء کے اقوال کا منکر نہیں ہوں۔ یہ تو میں نے اس لئے کہا ہے کہ

آپ کو اپنے اعتراضات کی سبکی کا احساس ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ کلام کو طول نہ ہو مگر جب آپ مصّر ہیں تو سنیے۔

مدارس کے ابتدائی درجوں میں ہزاروں طلبا ہر سال داخل ہوتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرتا ہے؟ ان میں سے کتنے ایسے نکلتے ہیں جو پی۔ایچ۔ڈی کرتے ہیں اور تعلیم میں انتہائی منازل تک پہنچتے ہیں؟

ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ جن کے مالی حالات مساعدت کریں گے وہ ہی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرسکیں گے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں۔ اکثر مالدار رہ جاتے ہیں اور نادار اعلیٰ منازل حاصل لیتے ہیں۔

اگر غور کریں ظاہر ہو جائے گا کہ جس میں اہلیت ہوتی ہے وہی کسی علم یا فن میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ اسی اصول پر کمالاتِ نفسانی بھی وہ ہی حاصل کرسکتا ہے جس میں فطری اہلیت ہو۔ یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

جب یہ امر واضح ہو گیا کہ ہر شخص حقیقت کا بار نہیں اٹھا سکتا اور کثرتِ عوام جہال کی ہوتی ہے۔ مفکرین تو بہت کم ہوتے ہیں لہٰذا نمازِ حقیقی کا بار ہر شخص پر نہیں ڈالا جا سکتا خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ ﴿۲۸۶﴾ البقرہ

اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اتنی تکلیف نہیں دیتا جو اس کی وسعت یا اہلیت سے زیادہ ہو۔

لہٰذا اگر عوام پر اتنا بار ڈال دیا جائے جس کے وہ متحمل نہ ہو سکیں تو نماز ہی سے بھاگ جائیں گے مگر ہر حال میں یہ تو ضروری ہے کہ عوام کو ایک تنظیم میں منظم رکھا جائے اسی لئے فقہائے کرام نے اپنے زمانہ کے عوام کی اہلیت کے مطابق اپنی رائے اور قیاس سے کچھ حدود مقرر کئے ہیں۔ ان پر اعتراضات کی بنیاد قائم کرنا صحیح نہیں۔

اب میں آپ کو قرآن کریم ہی سے دکھلاتا ہوں آپ خود ہی ترجمہ دیکھ لیں کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ آیاتِ قرآنیہ ہی سے آپ کے تمام اعتراضات رد ہو جائیں گے۔ مگر یہ احکام ان ہی لوگوں کے لئے ہیں جو تقربِ بارگاہ ایزدی کے طالب ہوں، تفکر و تدبّر کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اب آیاتِ

قرآنیہ دیکھیں۔

① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴿۴۳﴾ النساء

اے وہ لوگو جو ایمان لائے نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک تم نشہ کی (یا غنودگی کی) حالت میں ہو۔ یہاں تک کہ تم یہ جان سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

دیکھئے یہاں نشہ یا غنودگی کے عالم میں نماز پڑھنے کو کیوں منع کیا گیا ہے۔ اس کا سبب بھی واضح کر دیا ہے کہ نشہ کی حالت میں آدمی نہیں سمجھتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لہٰذا جب تک اتنی صحتِ ذہنی نہ ہو اور حواس اتنے درست نہ ہوں کہ وہ یہ جان سکے کہ کیا کر رہا ہے اس وقت تک نماز کے قریب نہ جائے۔ یہاں یہ تو نہیں کہا گیا کہ نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک تم یہ نہ جان سکو کہ تم کیا پڑھ رہے ہو حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تقرءون نہیں بلکہ تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ہے (جان سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو)۔

تمام فقہائے اسلام اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ اگر کسی شخص نے شراب پی، اس کے بعد نماز پڑھی تو اگر نشہ نہیں ہے تو نماز اس کی درست ہے۔ اس کا یہ فعل بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے جھوٹ بولا یا کسی کی غیبت کی۔ اس کے بعد نماز پڑھی تو نماز سے قبل جو گناہ اس نے کئے ان کی سزا کا حقدار ہے۔ نماز پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اسی طرح شراب پینا بھی ایک گناہ ہے۔ پینے والے کو اس کی سزا ملے گی۔ پس اگر نشہ نہیں ہے اور نماز پڑھتا ہے تو نماز سے قبل جو گناہ اس نے کیا ہے اس کی نماز میں فساد کا باعث نہ ہو گا۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ فقہاء تو نماز میں معانی و مفاہیم کا سمجھنا ضروری نہیں بتلاتے۔ بے شک عوام کے لئے یہ سہولت دینا ضروری ہے۔ مگر جو شخص صفائے قلب اور تقرب ایزدی حاصل کرنے کا طالب ہو، اس کے لئے یہ مشکل نہیں۔ ہر مسلمان چند سورے اور تسبیحات التحیاہ وتشہد وغیرہ نماز کے لئے حفظ کرتا ہے تو کیا ان کے معانی یاد نہیں کر سکتا اگر معنی سمجھ کر حفظ کرے تو بے سمجھے ازبر کرنے کی نسبت کم وقت میں حفظ ہو سکیں گے۔ پھر نماز بھی سمجھ کر پڑھے گا۔

② نماز میں توجہ بالقلب ضروری ہے یا نہیں؟ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ چیزیں عوام کے لئے نہیں ہیں بلکہ صاحبانِ فکر کے لئے ہیں۔ جوان کا بار اٹھانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ دیکھئے ارشاد باری ہے:۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ قف وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۲۹ اعراف

کہہ دو میرے رب نے عدل کا حکم دیا ہے اور تم اپنے نفسوں کو قائم کرلو ہر نماز کے وقت اور اس کو پکارو اسی کے لئے دین خالص کرتے ہوئے۔

اس آیت کا پہلا فقرہ دیکھئے۔ رب نے عدل کا حکم دیا ہے۔ عدل کے معنی ہیں، کسی شے کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا۔ اس آیت کا صرف ایک جُز اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ (میرے رَب نے عدل کا حکم دیا ہے) اسلام کا مقصد سمجھانے کے لئے کافی ہے کہ رَب کا حکم یہ ہے کہ ہر شے کو اور اپنی ہر ظاہری و باطنی قوت کو بندہ اس کے صحیح مقصد کے لئے استعمال کرے ورنہ عدل نہ ہوگا بلکہ ظلم ہوگا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ بغیر اصلاحِ نفس عدل کر سکے۔ جب تک انسان کے خواہشات و جذبات عقلِ فطری سے مغلوب نہ ہو جائیں، اعتدالِ کلّی پر قائم رہنا ممکن نہیں اور نفس میں یہ کیفیت بغیر توجہ الی اللہ پیدا نہیں ہوسکتی۔

ہوسکتا ہے آپ کہنے لگیں، یہ تو تاویل ہوئی۔ آپ نے اپنی مرضی کے مطابق ایک مطلب استخراج کرلیا۔ اس آیت سے توجہ کہاں ثابت ہوتی ہے۔ تو اب آیت کا دوسرا جز دیکھیں۔ ''ہر نماز کے وقت اپنے نفس کو قائم کرلو''۔ یعنی اپنی توجہ یکسو کرلو۔ ایک مرکز پر قائم کرلو۔ ورنہ اس کے سوائے نفس کو قائم کرنے کا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ ہر چند کہ اس سے اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا مگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی واضح دلیل نہ ہوئی، تو آیت کا تیسرا جز دیکھ لیں۔ ''اُس کو پکارو دین خالص کرتے ہوئے اُسی کے لئے۔'' اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہاں توجہ بالقلب اور خلوصِ کامل طلب کیا جارہا ہے۔

ممکن ہے کہ آپ کہنے لگیں کہ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْن کے کیا معنی ہیں اور آپ نے کس دلیل سے یہ مطلب اخذ کیا تو سورۂ یونس کی یہ آیت دیکھ لیں۔ اس سے صاف واضح ہوجائے گا کہ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْن سے مالک کی مراد کیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ یونس

وہ وہی (آقا) ہے جو تم کو خشکی اور تری میں سیر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوں اور موافق ہوائیں ان کو لے کر چلیں اور اس سے خوش ہوئے۔ ناگاہ اس پر تیز ہوا کا جھونکا آپڑا اور ہر طرف سے موجیں اٹھنے لگیں اور گمان کرنے لگے کہ اب بالکل گھر گئے۔ اس وقت پکارتے ہیں اللہ کو دین خالص کرتے ہوئے اس کے لئے۔

یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ سے وہ کیفیتِ نفسی مراد ہے جو کشتی میں سوار ہونے والوں کے نفوس پر طوفان کے وقت طاری ہوتی ہے۔

ان الفاظ کا کوئی اور ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ خلوصِ کامل کی کیفیت ہے کہ اس وقت کوئی اور خیال آ ہی نہیں سکتا۔ بس مالک کی طرف ہی لَو لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی کیفیتِ خلوص نماز میں طلب کی جارہی ہے۔ اس سے زیادہ اس امر کا کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ نماز میں توجہ ضروری ہے مگر یہ انہی لوگوں کے لئے ہے جو طالبینِ تقربِ ایزدی مفکّر و مدبّر ہوں نہ کہ عوام الناس۔

(۳) تیسرا فقرہ آپ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اٹھا بیٹھی سے خوش ہوجاتے ہیں تو اس کا جواب بھی سنیں اور دیکھ لیں کہ آیا وہ خوش ہوتے ہیں کہ نہیں۔

یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نہ مفہوم سمجھتے ہیں نہ توجہ قائم کرسکتے ہیں مگر اتنا تو ہر شخص کو خیال ہوتا ہے کہ مالک کی بندگی کر رہا ہوں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ربی الاعلی، ربی العظیم، رب العالمین۔ اللہ اکبر کہتے ہوئے اس کی کچھ نہ کچھ توجہ تو مالک کی طرف ضرور ہوجاتی ہے۔ ایک نادان جاہل بھی جب نماز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ مالک کا حکم بجالاتا ہوں اور تھوڑی دیر کو خواہ وہ چند سیکنڈ ہی ہوں۔ رَب کے لئے خلوص پیدا ہوتا ہے۔

اچھا اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ ایک شخص ایسا ہے کہ اس کے دل میں نماز سے قبل یا دوران نماز ذرا

دیر کو بھی مالک کے لئے خلوص پیدا نہیں ہوا تو بعد نماز اپنے مطالبِ دنیوی کے لئے دُعا ضرور کرے گا۔ اس وقت خلوص ضرور پیدا ہوگا اور قربانی کے ذکر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط ۳۷ حج

اللہ تعالیٰ کو نہ تو ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون۔ لیکن اس کو تمہارے دل کا خلوص پہنچتا ہے۔

اب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک جاہل کے دل میں بھی کچھ نہ کچھ خلوص ضرور پیدا ہوتا ہے اور جتنا بھی خلوص پیدا ہوگا۔ اسی نسبت سے اس کو صفائے قلب حاصل ہوگی۔ بندے کے قلب کی صفائی ہی اللہ تعالیٰ کا خوش ہونا کہلاتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کوئی آدمی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ کسی سے خوش اور کسی سے ناخوش ہوجائیں۔

۴ اب یہ بھی دیکھ لیں کہ نماز عرش پر جاتی ہے یا نہیں۔ پس اگر قبول ہوئی تو عرش پر رکھ لی جاتی ہے ورنہ پڑھنے والے کے منہ پر ماردی جاتی ہے۔ جناب باری تعالیٰ عزاسمہ، کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۲۴ انفال

اور جان لو کہ اللہ پاک آدمی کے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوتے ہیں اور یہ کہ تم اُسی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اور حضور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:۔

قلب المومن عرش اللہ (مومن کا دل اللہ تعالیٰ کا عرش ہے)۔

حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ نے اس حدیث کا ترجمہ اپنے دوشعروں میں کردیا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنیاد خلیل آذر است
دل گزر گاہِ جلیل اکبر است!

اب تو واضح ہو گیا کہ جب کوئی بندۂ مسلم نماز پڑھتا ہے تو جتنی بھی توجہِ خالص ہو سکی جتنا بھی خلوص پیدا ہو سکا۔ اس کا اثر دل پر ہوتا ہے۔ پس اگر دل کی سیاہی کچھ کم ہوئی۔ اور نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوئی تو گو یا نماز عرش پر رکھ لی گئی۔ یعنی دل پر اس کا اثر ہوا اور اگر قلب پر اثر نہ ہوا تو نماز پڑھنے والے کے منہ پر ماردی جاتی ہے کہ اس کو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ بڑا نمازی اور پرہیز گار ہے۔ نماز کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ اس سے صفائے باطن پیدا ہو اور دل میں برائیوں سے بچنے کی طاقت پیدا ہو جائے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ۝۴۵ عنکبوت

تحقیق کہ نماز بے شرمی کے کاموں اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔

پس نماز کی قبولیت یہی ہے کہ دل میں بُرے کاموں سے بچنے کی اور نیک عمل بجا لانے کی طاقت اور رغبت پیدا ہو۔ اگر دل پر ایسا اثر نہ ہوا تو نماز قبول نہیں ہوئی۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

الصلوٰۃ عماد الدین ان قبلت قبل ما سواھا وان ردت رد ما سواھا۔ (نماز دین کا ستون ہے۔ اگر وہ قبول ہوئی تو دیگر اعمال بھی قبول ہوتے ہیں اور اگر وہ رد کر دی گئی تو تمام عمل بھی رد کر دیئے جاتے ہیں)۔

نماز کی قبولیت یہی ہے کہ اس سے صفائے قلب پیدا ہو۔ پس اگر نماز قبول ہوئی یعنی اس سے صفائے قلب پیدا ہوئی اور امورِ خیر کی طرف رغبت ہوئی تو تمام اعمال پر اس کا اثر ہونا لازم ہے کہ اس کے اعمال صحیح اور درست ہوں گے اور یہی ان کی قبولیت ہے اور اگر دل پر یہ اثر نہ ہوا تو نماز قبول نہ ہوئی تو اور تمام عمل بھی درست نہ ہوں گے۔ ان میں بھی خلوص نہ ہو گا اور یہی ان کا رد ہونا یا قبول نہ ہونا ہے۔

یہ تو ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم میں اتنی اہلیت نہیں کہ وہ نعمتیں حاصل کر سکتے جو نماز سے ملتی ہیں۔ اگر نمازِ حقیقی صحیح طریقہ سے ادا کی جا سکے تو چند سال میں عالمِ نُور کا مشاہدہ ہو جائے اور ہر طرف جلوۂ محبوب نظر آنے لگے اور کہتا رہے۔

ہر سمت ہر طرف نظر آنے لگے ہو تم
یہ کیا فسوں گری سی دکھانے لگے ہو تو

فالحمد للہ رب العالمین اللھم اھدنا الصراط المستقیم

اس کے بعد صاحب موصوف نے نمازِ جماعت، روزہ اور وضو کے متعلق شکوک و وساوس پیش کئے۔ جس کے جوابات عقلی وفطری دلائل سے ان کے سامنے پیش کئے۔ اور ان ہی امور پر بعض دیگر حضرات سے بھی مختلف مواقع پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔

ان تمام مضامین کو یکجا کر کے آئندہ صفحات میں پیش کرتا ہوں۔ دورانِ گفتگو حوالجاتِ کتب وغیرہ کی تفصیل بیان نہیں ہوسکتی تھی۔ اب ناظرین کی سہولت کے لئے حوالجاتِ کتب وغیرہ بھی درج کر دیئے ہیں۔

نمازِ جماعت

معترض کا ایراد یہ تھا کہ عبادت کا مقصدِ وحید توجہ الی اللہ ہے جو تنہائی میں ہی ہو سکتی ہے۔ جماعت یا اجتماع میں یکسوئی توجہ ممکن نہیں۔ پھر نمازِ جماعت مدارجِ روحانی میں ترقی حاصل کرنے کے لئے کیا فائدہ دے سکتی ہے؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟

الجواب بعون الوہاب

اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط تخیل پر قائم ہے۔ نمازِ جماعت میں مقتدی امام کی قرأت سنتے ہیں اور یہ فطری امر ہے کہ جب کوئی مقرر کسی مجمع میں تقریر کرتا ہے تو سامعین کی توجہ اس کی تقریر کی طرف ہوتی ہے۔ دوران تقریر سامعین کو کوئی خیال نہیں آتا۔ سب ہمہ تن گوش ہوتے ہیں۔ نماز فرادیٰ میں جب مصلی خود قرأت کرتا ہے تو اکثر خیالات کا ہجوم ہوتا ہے اور یکسوئی توجہ مشکل ہو جاتی ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ نفسِ انسان بغیر عادت اور مشق کے کوئی کام پوری طرح انجام نہیں دے سکتا اور جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ کا ارشاد ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۱۰﴾ الجمعہ	پس جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی روزی کماؤ) اور اللہ کی یاد بہت زیادہ کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے بندگانِ خاص مومنینِ کاملین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴿۳۷﴾ النور	وہ مرد ہیں کہ نہیں غافل کرتی ان کو تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے۔

پس کاروبارِ دنیا میں، خرید وفروخت میں اور معاملاتِ تجارت میں مصروف رہتے ہوئے اللہ کی یاد کرتے رہنے کا حکم ہے اور یہ معاملات جماعت اور اژدھام ہی میں ہوتے ہیں لہٰذا اجتماع میں خدا کی طرف توجہ کرنے کی مشق کرانا بھی ضروری ہے جس کا بہترین ذریعہ نمازِ جماعت ہی ہوسکتی ہے۔

اب رہے اس کے بے شمار دیگر فوائد اور اس کے راز۔ وہ تو خدا اور رسول ہی جانتے ہیں، ہمیں تو ان کا علم نہیں۔ انسان کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾ اسراء — اور نہیں دیا گیا تمہیں علم مگر بہت تھوڑا۔

عقلِ انسان کے مدارج بہت مختلف ہیں۔ ہر شخص غور وفکر کر کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ پس جتنی جس شخص کو عقل ہوگی اور جہاں تک اس کی فکر کی رسائی ہوگی۔ اسی کے اندازے کے مطابق نتائج اخذ کر سکے گا۔ ایک معمولی عقل والا انسان جو نتائج اخذ کرسکتا ہے پیش کرتا ہوں۔

دیکھئے انسان کی دو زندگیاں ہیں۔ حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی۔ بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے اس کے ''خواہشات وجذبات'' بھوک و پیاس، سرور والم یعنی خوشگواری اور ناگواری پر منحصر ہوتے ہیں۔ بتدریج وہ اُنس ونامونسی سے بھی روشناس ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں انانیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں بھی اس دنیا میں تمام چیزوں سے علیحدہ ایک وجود ہوں۔

اس احساس کے ساتھ ہی خواہشِ بقا ظاہر ہوتی ہے یعنی نفس یہ چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ رہ سکوں۔ لہٰذا فنا سے خائف ہوتا ہے۔ خواہشات وجذبات کی تسکین سے اس کو سُرور ہوتا ہے۔ ان کے قطع ہونے یعنی تسکین نہ ہونے سے اضطرار لاحق ہوتا ہے۔ نفس یہ جانتا ہے کہ اگر میری خواہشات پوری نہ ہوسکیں تو فنا ہوجاؤں گا۔ لہٰذا تمام اسبابِ تسکینِ خواہشات اُس کو محبوب ہوتے ہیں۔ اِسی لئے اُس کو مال ودولت، اسبابِ زینت، عزیز واقارب، جائداد، مویشی وغیرہ پیارے ہوتے ہیں۔

اُس کی محبت کا مرکز تو ''انا'' ہے۔ وہ تو صرف اپنی ''میں'' سے محبت کرتا ہے۔ لہٰذا جن اشیاء یا افراد سے اس کی ''میں'' یا ''انا'' کا تعلق ہوتا ہے پیارے ہوتے ہیں۔ مثلاً میری ماں، میرا باپ، میرے

اعزہ، میرا کنبہ قبیلہ، میری قوم وغیرہ۔

جو خیالات وعقائد غیر محسوس اشیاء اور غیر محسوس عالم غیر مرئی دنیا عالمِ غیب کے متعلق اپنے بزرگوں اور ماحول سے سنتا ہے وہ غیر ارادی اور لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں۔ جو رسم ورواج بچپن سے دیکھتا رہتا ہے۔ جو عقائد ورواسمِ مذہبی اس کو لاشعوری طور پر اِرث میں ملتے ہیں وہ اُس کا ''میرا مذہب'' ہوجاتے ہیں۔ اور بہت محبوب ہوتے ہیں۔ اُن پر نہ خود تنقید کرسکتا ہے اور نہ کسی سے سُن سکتا ہے۔ اُس کو اُن عقائد ورواسم کے برخلاف ہر نظریئے سے نفرت ہوتی ہے۔

احساسِ انانیت کے ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ ''میں سب سے بڑا''۔ ''میں سب سے اچھا''۔ اور یہ بھی قانونِ فطرت ہے کہ جب نفس کو اِس کا احساس ہوتا ہے کہ جو چیز میرے پاس ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں تو اس کو احساس برتری ہوجاتا ہے۔ اپنے آپ کو اُس سے اعلیٰ ارفع سمجھنے لگتا ہے۔

میں سب سے بڑا، میں سب سے اچھا کا احساس اُس کو غیر کی اطاعت سے روکتا ہے مگر جب کسی کے پاس ایسی شے یا قوت دیکھتا ہے جس سے یہ محروم ہے یا دوسرے کے پاس اس سے زیادہ ہے مثلاً جسمانی قوت، مال ودولت، علم وقدرت واہلیت وغیرہ تو اس سے مرعوب ہوجاتا ہے اور نفس میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے تو اکثر اوقات اُس سے حسد کرنے لگتا ہے۔

تنہائی سے اُس کو وحشت ہوتی ہے تو رفیق کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ اپنے ہم خیال وہم مشرب کی جستجو کرتا ہے۔ بچوں کو دیکھیں ساتھ کھیلنے کے لئے دوسرے بچوں کو ملاتے ہیں۔ مل جل کر کھیلتے ہیں۔ مگر جب ایک کی ''انا'' دوسرے سے ٹکراتی ہے تو لڑائی ہوجاتی ہے۔ لڑ بھڑ کر پھر ایک ہوجاتے ہیں۔ ابھی لڑائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر سب مل جل کر کھیلتے نظر آتے ہیں گویا کہ یہ لڑے ہی نہ تھے۔ بچے تو جلد بھول جاتے ہیں۔ ان کے ننھے دل بُغض سے پاک ہوتے ہیں۔ مگر بڑوں کے دلوں میں جو کینہ بیٹھ جاتا ہے وہ نہیں نکل سکتا۔

جب دو اشخاص میں لڑائی ہوتی ہے تو وہی غالب ہوتا ہے جس کی قوتِ دفاع زیادہ ہو خواہ

جسمانی، ذہنی یا اجتماعی۔ حیاتِ انفرادی میں انسان تنہا اپنی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا۔ اس کو دوسروں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے تلاش وطلبِ رفیق کا جذبہ تو ابتداء ہی سے نفس میں موجود ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ انسان متمدن پیدا ہوا ہے۔

نفسِ انسانی کے فطری احساسات کہ ''میں سب سے بڑا'' ''میں سب سے اچھا'' میرا مذہب اور میرے نظریات ہی حق ہیں۔ میری قوم قبیلہ سب سے زیادہ شریف اور عزت والے ہیں۔ ہر چند کہ یہ انفرادی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ مگر اِن احساسات وجذبات کے باعث وہ دوسروں کے جذبات و احساسات کا لحاظ نہیں کرتا۔ چونکہ نفسِ انسان مقصدِ زندگی یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی طرح اپنے آپ کو اِس قابل بنالوں کو اپنے ہر خواہش وجذبہ کی تسکین کرسکوں اور میں جو چاہوں وہ ہوجائے اور اِس اہلیت کے حصول کا ذریعہ مال ودولت کی بہتات کو جانتا ہے۔ اِس لئے اُس کو اپنے اغراض کے حصول میں دوسروں کے اغراض واحساسات کا خیال ہی نہیں آتا۔ وہ اُس طرف کبھی توجہ ہی نہیں کرتا کہ اِس سے دوسروں کو اذیت یا نقصان تو نہیں پہنچے گا اور یہی بات باعث فساد ہوتی ہے۔ اکثر جنگ وجدل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

جب ایک جماعت یا قوم کے یہ جذبات اُن کے اغراض ومقاصد ونظریات دوسری جماعت یا قوم کے جذبات واغراض ونظریات سے ٹکراتے ہیں تو فساد فی الارض کا باعث ہوتے ہیں اور نتیجہ میں جنگیں اور خونریزیاں واقع ہوتی ہیں۔ لڑائی میں صرف جذباتِ بہمیت کارفرما ہوتے ہیں۔ تمام افراد انسانیت کو فراموش کرکے درندے بن جاتے ہیں۔ قتل عام، غارت گری، لوٹ مار میں، زن ومرد، بوڑھا، بچہ، ضعیف ومریض کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔ رحم وکرم کا تو نام ونشان ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ کلامِ پاک میں بلقیس ملکہ سبا کا قول نقل کیا ہوا ہے:۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ نمل

بادشاہ جب کسی بستی میں (فتح کرکے) داخل ہوتے ہیں تو اس کو اجاڑ دیتے ہیں اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

چونکہ حفاظتِ خود اختیاری اور بقائے حیاتِ اجتماعی کے لئے جنگ ناگزیر ہے لہٰذا اسلام نے دشمنانِ دین سے دفاع کے لئے مسلمانوں کولڑائی کی اجازت دی۔ مگر ظلم وتعدی، وحشت و بربریت کی سخت ممانعت کی اور یہ ظاہر کر دیا کہ جنگ کی اجازت محض فتنہ وفساد مٹانے کے لئے ہے۔ فساد پھیلانے کے لئے نہیں ہے۔ جیسا کہ جناب رب العزت کا ارشاد ہے:۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ الحج

ان مسلمانوں کو جن سے وہ (کفار) لڑا کرتے تھے اجازت دی گئی۔ (لڑائی کی) اس سبب سے کہ وہ ستائے گئے۔ بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو البتہ ڈھائے گئے ہوتے نصاریٰ کے گرجے، یہود کے عبادت خانے، مجوس کے عبادت خانے اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر بکثرت ہوتا ہے اور اللہ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اس کی مدد کریں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست اور غالب ہے۔

نیز دوسرے مقامات پر ارشاد ہے:۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ بقرہ

اور اللہ کی راہ میں قتال کرو ان لوگوں سے جو تم سے قتال کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔۔(الآخ) ﴿۲۹﴾ توبہ

ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور یوم قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہیں حرام جانتے ان چیزوں کو جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کر دی ہیں۔ (تا آخر آیت)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾ الانفال

اور ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور (ہر طرف) خدا کا دین ہی ہو جائے۔ پھر اگر یہ (فساد سے) باز آ جائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے اس کو جو وہ کریں۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے لڑائی کی اجازت حفاظتِ خود اختیاری اور دفاع کے لئے دی ہے جس کا مقصد فساد پھیلانا نہیں بلکہ فتنہ و فساد کو زمین سے مٹانا مقصود ہے۔

جنگ میں عام دستور ہے کہ غالب گروہ مغلوب کا مال و اسباب لوٹنے اور غارت گری میں مصروف ہو جاتا ہے اور جنگی قیدیوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرتا ہے۔ اسلام نے جنگ کی اجازت کے ساتھ ان غیر انسانی افعال کی سخت ممانعت کر دی۔ چنانچہ جنگ بدر میں جو کفار قید ہوئے تھے وہ اس امر کے معترف تھے کہ ہمارے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ قیدی جن اشخاص کی نگرانی میں تھے وہ اکثر ان کے لئے ایثار کرتے تھے۔

عرب کے قدیم دستور کے مطابق غزوہ بدر میں مسلمان بغیر اذنِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال غنیمت لوٹنے پر ٹوٹ پڑے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے عتاب کی آیت نازل فرمائی۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ انفال

اگر پہلے سے خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا نہ ہوتا تو البتہ اس کے باعث جو تم نے کیا تم کو بہت بڑا عذاب پہنچتا۔

عرب میں مال غنیمت کا لوٹنا اخلاقی فرض اور بڑا ممدوح فعل سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی مرحوم سیرت النبی جلد اول میں رقمطراز ہیں:۔

''مال غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بڑا سبب یہی ہوتا تھا۔ اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی۔ تعجب یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہو کر بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے رہے۔''

ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا۔ ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا، اور لوگوں نے اس سے کہا، پھر جا کر پوچھو شاید تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا۔ بار بار لوگ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا۔ بالآخر جب آپؐ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ: لا اجر له اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا تب لوگوں کو یقین آیا۔ قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت متاعِ دنیوی کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک و وارفتگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگ اُحد میں جب اِسی بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری:۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ﴿۱۵۲﴾ آل عمران

اور تم میں ایسے لوگ ہیں جو دنیا کے خواستگار ہیں اور تم ہی میں ایسے لوگ ہیں جو آخرت کے خواستگار ہیں۔

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے

لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔ ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اتر گئی اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا۔ (علامہ کا کلام ختم ہوا)

مذکورہ بالا آیات واحادیث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے جنگ کی اجازت ان شرائط کے ساتھ دی ہے کہ وحشت و بربریت کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ انسانیت کو نہ بھلائیں۔ کسی عورت، بچے، ضعیف، بیمار یا ملازم سے تعرض نہ کریں۔ ان کو قتل نہ کریں کچھ اذیت نہ پہنچائیں۔ صرف لڑنے والوں سے لڑیں اور فقط اعلائے کلمۃ اللہ اور دفع شر وفساد کے لئے جنگ کریں۔

جب حفاظتِ خود اختیاری اور بقائے حیات اجتماعی کے لئے جنگ لازمی اور ضروری ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ افراد جماعت میں ضم ہو جائیں اور تشکیلِ جماعت کے لئے سب سے پہلی چیز باہم موانست ہے جو اکثر ملتے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسری چیز جو اُنس پیدا کرتی ہے وہ وحدتِ عمل ہے۔ دفاع کے لئے فوجی تنظیم کی ضرورت ہے جس کے لئے اقوامِ عالم میں سپاہیوں کو فوجی پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ایک آواز پر یکساں حرکت کرنے کے عادی ہو جائیں اور صف بندی کے عادی رہیں۔

جنگ میں اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ افرادِ جماعت میں احساسِ برتری و کمتری نہ ہو۔ وہاں تو امیر وغریب، شریف ورذیل کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔ ضروری ہے کہ اس وقت تمام افراد کے نفوس میں مساوات و ہمدردی کا احساس کارفرما ہو۔

ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کو فوجی تنظیم کے لئے قواعدِ پریڈ سکھائے جاتے مگر اسلام محض حیاتِ مادی کی تعلیم کے لئے نہیں آیا تھا۔ اس نے تو مادی اور روحانی زندگی کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ہماری دنیا دین بن جائے۔ یہ تو ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم نے دین کو بھی دنیا بنا ڈالا۔

مذکورہ بالا تمام مقاصد کے حصول کے لئے اسلام نے نمازِ جماعت کا حکم دیا، تا کہ مسلمان روزانہ پانچ مرتبہ باہم ملتے رہیں۔ ایک دوسرے سے شناسائی پیدا ہو اور یہ ملاقات موانست کا باعث ہو جائے۔

اُنسِ باہمی کا دوسرا ذریعہ وحدتِ عمل ہے۔ جب سب ایک ساتھ مل کر ایک جیسے حرکات و سکنات کریں گے تو باہم اُنس پیدا ہوگا۔

جنگ کے لئے صف بندی کا عادی ہونا ضروری ہے۔ نمازِ جماعت سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ایک آواز پر تمام افراد صف بستہ ہو جانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ نماز جماعت سے بعض اہم اور ضروری امور کی عادت راسخ ہو جاتی ہے مثلاً:

① ایک افسر یا امیر (امام) کی آواز پر سب یکساں حرکت کرتے ہیں۔

② احساسِ برتری و کمتری باقی نہیں رہتا۔ کوئی رئیس صفِ اوّل میں کھڑے ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ کسی بڑے سے بڑے صاحبِ ثروت کو یہ خیال بھی نہیں آسکتا۔ اپنے لئے کوئی ممتاز مقام حاصل کرے۔ مثلاً امام کی داہنی طرف کھڑا ہونا چاہے۔ وہاں تو سب مساوی ہوتے ہیں۔ برتری و کمتری کا احساس نہیں رہتا۔ عملی مساوات کا مظاہرہ ہوتا ہے ا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

(علامہ اقبال)

③ ظلم و بربریت اور غیر انسانی افعال سے بچانے کا ذریعہ واحد خدا کی یاد ہے۔ اسی لئے جہاد میں بھی یہی حکم ہے جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُواْ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٤٥﴾ انفال	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم کسی فوج سے مڈبھیڑ کرو تو اپنے قدم جمائے رہو۔ اور اللہ کی یاد بہت زیادہ کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

یہ نمازِ جماعت ہی ہے جس میں صف بستہ ہو کر خدا کی یاد کرنے و تسبیح و تکبیر کرنے کی نفوس میں

عادت راسخ ہوجاتی ہے۔

④ دفاع کے لئے ضروری ہے کہ ایک آواز پر افراد جمع ہوجانے کے عادی ہوں۔فوج میں بگل کی ایک آواز پر سب مجتمع ہوجاتے ہیں۔نمازِ جماعت سے یہ بھی فائدہ ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی جمع ہونے کے عادی ہوجاتے ہیں۔

ہر مسجد میں روزانہ قُرب وجوار کے لوگ ہی جمع ہو سکتے ہیں۔ بڑے اجتماع کے لئے نمازِ جمعہ کا حکم دیا گیا تا کہ ہفتہ میں ایک دن کئی محلوں کے مسلمان مسجدِ جامع میں جمع ہوں، اور شناسائی وموانست کا دائرہ وسیع ہوجائے۔اس کے لئے فرمان رب العزت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِىَ	اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جس وقت پکارا
لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا	جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو دوڑ پڑو اللہ
اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ ؕ ذٰ لِكُمۡ	کے ذکر کی طرف اور خرید وفروخت چھوڑ دو۔
خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝٩ الجمعہ	تمہارے لئے یہی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

ہر ملک میں دستور ہے کہ سال میں چند دن اس کام کے لئے معین کئے جاتے ہیں کہ افواج جمع ہو کر اپنے بادشاہ یا ملک کے لئے اظہارِ وفاداری کا اور شوکت وقوت کا مظاہرہ کریں، جس سے اغیار مرعوب ہوں۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے سال میں دو عظیم اجتماع کے دن مقرر کئے ہیں۔عید الفطر اور عید الاضحٰی ،تا کہ کئی میل کے گھیرے میں بسنے والے مسلمان ایک عید گاہ میں جمع ہوں اور خدائی فوج کے یہ سپاہی ملک الناس کی بارگاہ عظمت وجلال میں وفاداری کے عہد کی تجدید کے لئے سربسجود ہوجائیں اور اس مظاہرہ عظیم سے دشمنوں کے قلوب مرعوب ہوں۔

اسلامی روزہ

اعتراض

''اسلام بھی عجیب مذہب ہے کہ سال میں ایک مہینہ فاقے کرنے کا حکم دیتا ہے۔جس سے جسم کمزور، صحت خراب ہوتی ہے۔عرب جیسے ملک میں لوگ بہت قوی تھے۔اس کو برداشت کر سکتے تھے مگر (غیر منقسم) ہندوستان کے باشندے کمزور ہیں۔ وہ اتنی قوت نہیں رکھتے کہ ایک مہینہ فاقے کر سکیں۔ یہاں روزے رکھنا مضرِ صحت ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکامِ اسلام تمام دنیا کے لئے واجب العمل نہیں ہیں''۔

ایک ظاہری مسلمان کی زبان سے ایسے مہمل اور لغو اعتراض سننا کس قدر گراں ہوتا ہے۔افسوس قوم کا کیا حال ہو گیا۔اکثر نوجوان افرادِ قوم دہریت میں غرق ہیں اور ظاہراً مسلمان کہلاتے ہیں۔تمام فرق اسلامیہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں۔مگر افسوس اس کی خبر نہیں کہ ان کی جڑ ہی کاٹی جارہی ہے۔اس طرف کوئی توجہ نہیں کرتا کہ ان کے خلاف دہریت کا بڑا منظم پروپیگنڈہ جاری ہے۔خدا ہمارے حال پر رحم کرے اور توفیق ہدایت عطا فرمائے۔آمین (مؤلف)

الجواب بعون الوہاب

بے شک اسلام عجیب مذہب ہی ہے اور ایسا عجیب ہے کہ انسان نما حیوانوں کو انسان اور مخدومِ ملائک بنا دیتا ہے۔فطرت جو ہر شے پر غالب و قاہر ہے اس پر غلبہ عطا کرتا ہے۔اطمینانِ قلب جیسی عظیم الشان نعمت عطا کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔جو نہ کسی علم و فن سے مل سکتی ہے۔نہ زر و جواہر سے حتیٰ کہ سلطنت مل جانے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔اسلام اس نعمت عظمیٰ کا وعدہ کرتا ہے جیسا کہ ارشادِ ربّ العزت ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ رعد	وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوجاتے ہیں۔آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوجاتے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔لہٰذا اس کے احکام وعقائد کے متعلق کوئی شخص اس وقت تک کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ فطرتِ نفسِ انسانی کا مطالعہ نہ کرے۔نمازِ جماعت کے بیان میں حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی یا حیاتِ قومی کے متعلق اجمالاً کچھ بیان کر چکا ہوں۔اب یہاں حیاتِ انفرادی کے متعلق تو مزید بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔البتہ حیاتِ اجتماعی یا حیاتِ قومی کے لئے اجمالاً مزید کچھ بیان کرنا ہوگا۔

تشکیلِ حیاتِ اجتماعی

افراد کی بقا کا انحصار جماعت اور قوم کی بقا پر ہے۔تشکیلِ جماعت کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز وحدتِ فکر ہے کہ سب کا مقصود ایک ہو۔محبوب ایک ہو۔خواہ وہ ملک ہو یا قوم،نظریہ ہو یا معبود۔اس کے بعد وحدتِ عمل کی ضرورت ہے۔ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خواہشات وجذباتِ انفرادی کو جماعت کے لئے قربان کرے اور جماعت میں فنا ہوجائے۔اسی وقت فرد کی بقا ہوسکتی ہے۔مرزا غالب مرحوم فرما گئے ہیں۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

اس سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فرد کی بقا کا انحصار اس پر ہے کہ جماعت میں فنا ہوجائے۔

جب کسی قوم کے افراد میں ہر شخص اپنے اغراض ومقاصد کو جماعت کے اغراض ومقاصد پر قربان کردینے کا عادی ہوجائے گا تو اس قوم کو عروج حاصل ہوگا۔اس کو اجتماعی غلبہ ملے گا۔مگر جب افراد میں خودغرضی غالب آجاتی ہے تو باہم حسد ومنافرت پھیل جاتی ہے۔ایک دوسرے پر فوقیت وبرتری حاصل کرنے کی خواہش غالب آجاتی ہے۔انفرادی فائدہ عاجل کے لئے جماعت کے نقصان کی پرواہ نہیں کرتے۔اس وقت شیرازۂ قومی منتشر ہوجاتا ہے۔

اقوامِ عالم کی تاریخ دیکھ جائیں وہی قوم برسر اقتدار آتی ہے جس کے افراد سخت جان، شدائد اور صعوبتیں جھیلنے والے، موت سے کھیلنے والے، ایثار اور قربانی کا جوش و ولولہ رکھتے ہوں۔ جب اقتدار حاصل ہوجاتا ہے۔ مال و دولت، حکومت و سلطنت مل جاتی ہے تو زمین پر یا گرم پتھروں پر بآرام سو جانے والے نرم ریشمی گدوں پر آرام کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔لق و دق بیابانوں میں ریگستانوں میں دھوپ، لُو، آندھی وغیرہ میں دوڑ دھوپ کرنے والے محلات کے اندر خفیف گرمی و سردی کے اختلاف سے بے چین ہونے لگتے ہیں۔ زمین پر، پتھروں پر، گھوڑے کی پشت پر بیٹھے ہوئے کھانا کھالینے والے گدے دار کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے کے عادی ہوجاتے ہیں۔غرض یہ کہ ہر طرح کے راحت و آرام میں پڑ کر عیش پرست و آرام طلب ہوجاتے ہیں۔ اُسی وقت سے اس قوم کا زوال شروع ہوجاتا ہے۔

کسی قوم کی حیاتِ اجتماعی کی بقا کے لئے اس کے افراد میں سخت جانی، جفاکشی، بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرنے کی اہلیت اور عادت ہونا ضروری ہے دشمنوں کے دفاع کے لئے جنگ ناگزیر ہے اورلڑائی میں ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ رسد رسانی کا سلسلہ عارضی طور پر کچھ وقت کے لئے منقطع ہوجاتا ہے اگر بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت نہ ہوگی تو بہت جلد ہتھیار ڈال دیں گے۔ منجملہ دیگر بے شمار فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہے جس کے لئے روزے کا حکم دیا گیا ہے۔

حیاتِ اجتماعی کے علاوہ انفرادی زندگی ہی میں دیکھیں کہ بھوک پیاس برداشت کرنے کی عادت کتنی ضروری ہے۔

ایک چشم دید واقعہ ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی بہت سے میکنیکل اور الیکٹریکل انجینئر بنا کر ملک میں پھیلا رہی تھی۔ ان کو عملی تربیت کے لئے کچھ عرصہ کسی فرم یا ورکشاپ وغیرہ میں کام کرنا ضروری ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ایک انجینئر صاحب نے پشاور ایم ای ایس میں مختلف وسائل استعمال کرکے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ایک عارضی جگہ حاصل کرلی۔شہر سے باہر ایک ٹیوب ویل لگایا جارہا تھا۔

اس کام کا انچارج ایم ای ایس کا ایک کیپٹن تھا۔ایک روز وہ بنارسی انجینئر صاحب کو اپنے ہمراہ کام پر لے گیا۔دن کے دس بجے کے قریب کیپٹن صاحب نے ان کو دیکھا کہ گھٹنوں پر سر ڈالے زمین پر

بیٹھے ہیں۔ جب اس نے دریافت کیا تمہارا کیا حال ہے؟ تو کہا، سر آج میں ناشتہ نہیں کرسکا۔ اس لئے کچھ کام کرنے کے قابل نہیں۔ شام کو واپسی پر کیپٹن صاحب نے ان کی شکایت پیش کردی اور دوسرے روز ہی برطرف کردیئے گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی میں پیش آنے والے حالات میں سے قریب قریب ہر حال کے لئے عملی تعلیم دی ہے۔ فاقے میں پیٹ پر پتھر باندھ کر دکھایا۔ اس کا ذکر تو ہم سن لیتے ہیں مگر اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ اس کا فائدہ کیا ہے؟ یہ تو عمل ہے جو کر کے دیکھے گا اس کو پتہ چلے گا۔

معاملہ یہ ہے کہ کئی وقت کے فاقے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل اور پھیپھڑے اب نیچے کو پیٹ کی طرف کھنچے جارہے ہیں۔ اس کیفیت سے ہاتھ پیر ایسے ڈھیلے ہوجاتے ہیں کہ حرکت دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ پیٹ پر پتھر یا کپڑے کا گولا کس کر باندھ لینے سے وہ کھچاؤ کی کیفیت باقی نہیں رہتی اور ہاتھ پیر اسی طرح کام کرنے لگتے ہیں جیسے سیری کی حالت میں کرتے ہیں۔

یہ فوائد تو کیفیاتِ ظاہری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ذرا قوائے باطنی کی طرف بھی توجہ کریں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حیاتِ انفرادی میں وہی شخص کامیاب رہتا ہے جو صاحبِ عقل وفراست ہو۔ انسان کی تمام زندگی شہوات وجذبات کی بندگی میں گزرتی ہے۔ جوشِ جذبات میں عقل کام نہیں کرتی۔ جب دو شخصوں میں لڑائی ہوتی ہے تو جس کے جذبات میں سکون ہوتا ہے، تدابیرِ دفاع سوچ سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مخالف کو اشتعال دلاتا ہے تاکہ جوشِ غضب میں اس کی عقل کام نہ کرسکے اور اس طرح اس کو مغلوب کرلیتا ہے۔ اسی لئے جذبات وخواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے اور روزہ اِسی کی مشق ہے۔ دیکھ لیں کہ حیاتِ انفرادی کے لئے یہ کتنا ضروری ہے۔

حیاتِ اجتماعی میں بھی وہی جماعت غالب رہتی ہے جس میں تعقل ہو۔ جس جماعت کا قائد زیادہ عاقل ہوگا، وہی کامیاب رہے گی۔ ایک مشکل یہ ہے کہ جماعت میں تعقل نہیں ہوتا۔ جب فرد جماعت میں ضم ہوجاتا ہے تو غور وفکر نہیں کرسکتا۔ جماعت میں تو محض جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔

یورپ میں علماءنفسیات نے تجربات کر کے مشاہدہ کیا ہے کہ جب پانچ چھ فلاسفروں کے مجمع میں ایک شخص نے تقریر کی تو دورانِ تقریر سامعین اپنی قوت فکر سے کام نہیں لے سکے۔

پس جب جماعت کی فطری کیفیت یہ ہو تو لڑائی میں ظلم و تعدی، وحشت و بربریت کے مظاہرے سے کیسے بچ سکتے ہیں اور اسلام نے اس کی سخت ممانعت کی ہے۔

اسلام کیسی جماعت بنانا چاہتا ہے؟ وہ آیاتِ ذیل سے واضح ہوجاتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۩ الفتح

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ کفار پر بڑے سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں ان کو دیکھو گے رکوع کرتے اور سجدہ کرتے۔ وہ خواستگاری کرتے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ الحج

وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر قابو دیدیں تو نماز کو قائم کریں، زکٰوۃ دیں، اچھے کاموں کا حکم کریں، بُرے کاموں سے روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیات سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام صالحین کی جماعت چاہتا ہے۔ بندگانِ جذبات اگر زمین پر قابو پاتے ہیں تو ظلم کرتے ہیں اور فساد فی الارض کا باعث ہوتے ہیں۔ جو خود ہی اچھے کام نہ کرے وہ دوسروں کو نیکی کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کو بھلائی کا حکم بھی دے گا تو اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ خود عملِ خیر نہ کرتے ہوئے دوسروں سے نیک کام کرنے کو کہنا یا خود برائی کرتے ہوئے دوسروں کو منع کرنا بے عقلی ہے۔ اسی کو کلام پاک میں واضح کیا گیا ہے۔

السجدۃ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ البقرۃ

کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلائے ہوئے ہو حالانکہ تم (خدا کی) کتاب کی تلاوت کرتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

جب یہ قانونِ فطرت ہے کہ جماعت میں تعقل نہیں ہوتا اور جماعت قائد کے حکم اور اس کے اشاروں پر چلتی ہے تو ضروری ہے کہ قائد میں تعقل اور غور وفکر کرنے کی اہلیت ہو۔ بندۂ جذبات نہ ہو۔ اس کے جذبات عقل پر غالب نہ ہوں اور ہر جماعت کا قائد افرادِ جماعت ہی میں سے بنایا جائے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جماعت میں ایسے افراد موجود ہوں جو انفرادی حالت میں عقل سے کام لینے والے ہوں۔

عام طور پر لفظ عقل قوتِ فکر کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اکثر غلطیاں بھی کرتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ہر شخص کی عقل یکساں نہیں ہوتی۔ مگر عقلِ حقیقی یا عقلِ فطری ہر شخص کے ساتھ ایک قوتِ نورانی ہے جو ہمیشہ صحیح راستہ کی طرف ہدایت کرتی ہے اِس کو ضمیر بھی کہتے ہیں۔ نفسِ انسان اپنی خواہشات وجذبات کی تسکین ہی میں مست رہتا ہے۔ عقل وضمیر سے مشورہ نہیں لیتا۔ بلکہ ضمیر کی آواز کو سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے بہت نقصانات اٹھاتا ہے۔

اسلام تو ایسی جماعت چاہتا ہے جس کے افراد عقل سے کام لینے والے ہوں۔ بندگانِ جذبات نہ ہوں۔ حیاتِ انفرادی، حیاتِ اجتماعی اور حیات بعد الموت میں فلاح حاصل کرنے کا ذریعہ عقل کے حکم سے کام کرنا ہے جو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہویٰ وہوس پر غلبہ حاصل نہ ہو۔ اسی لئے جنابِ رَبُّ العزت نے بے سوچے سمجھے، بغیر عقل سے مشورہ کئے ہویٰ وہوس کی پیروی کرنے کو شرک قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴿۲۳﴾ جاثیہ

(اے رسول) کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنایا ہوا ہے۔

اسی طرح کی کتنی آیات کلام پاک میں موجود ہیں۔ جن میں خواہشات وجذبات کی بے سوچے سمجھے پیروی کرنے کو شرک قرار دیا ہے یا شہوات وہویٰ کی پیروی کی مذمت کی گئی ہے۔

پس جب دنیا وآخرت میں حصولِ فلاح کا انحصار تعقل پر ہے جو اس وقت تک ہو نہیں سکتا جب تک خواہشات وجذبات پر غلبہ حاصل نہ ہو اور یہ اصولِ فطرت ہے کہ انسان عملی مشق کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ نے پیروئ جذبات کی مذمت کرکے اس کو شرک قرار دے کر صرف کہہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہویٰ وہوس پر غلبہ حاصل کرنے کی مشق کے لئے سال میں ایک مہینے کے روزے لازم قرار دیے تاکہ ایک مہینہ خواہشات وجذبات کے دبانے کی مشق کریں۔ جو لوگ ایک ماہ ایسا کرسکیں گے وہ باقی گیارہ ماہ میں بھی تھوڑا بہت تو اس پر عمل کرتے رہیں گے۔ اِن فوائد کے گنانے کے لئے تو دفتر درکار ہیں۔ مانفدت کلمٰت اللہ۔ اللہ کے کلمے تو ختم ہو ہی نہیں سکتے۔ پس اب ایک فائدہ اور دیکھ لیں۔

روحانی ترقی، وجود باری تعالیٰ کا یقین اور ادراکِ عالمِ غیب حاصل کرنے کے لئے قلبی توجہ اور خلوص سے اللہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ عام حالات میں خلوص سے توجہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر خلوئے معدہ میں یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔

جو شخص روزے میں ہلکی غذا سحر کو کھائے اور خوب سیر ہو کر نہ کھائے اور قلبی توجہ کے ساتھ رَب کا ذکر کرتا رہے۔ وہ ہی مالک کی نعمات کا مزہ چکھے گا۔ اس کو ادراکِ عالمِ نور اور ایمان بالغیب کی نعمت مل جائے گی۔ مگر ہم تو ایسے بدنصیب ہیں کہ ہم نے روزے کو ایک رسم بنالیا ہے۔ اس خیال سے کہ دن میں کہیں بھوک نہ ستائے۔ سحر کو خوب ڈٹ کر ثقیل غذائیں کھاتے ہیں جن سے تمام دن نشہ سا سوار رہتا ہے پھر توجہ اور رَب کی یاد کیسے ہو سکے گی۔

اکثر لوگوں کو روزے میں غصہ زیادہ آتا ہے۔ بعض کو کہتے سنا ہے "جانتے نہیں میرا روزہ ہے" گویا کہ روزہ سکونِ جذبات پیدا کرنے کے بجائے اشتعالِ جذبات کا ذریعہ ہو گیا۔ خدا ہمارے حال پر رحم کرے اور اپنے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت فرمائے اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

فلسفۂ وضو

بعد حمد و نعت خدمت برادرانِ دینی میں عرض ہے کہ کئی مسلمان نما دہریوں سے مختلف مواقع پر مسائل دینی پر بات چیت ہوئی۔ ایک حضرت تو ایسے دل جلے تھے کہ انہوں نے مذہب کے خلاف بڑا طول طویل لیکچر دے ڈالا۔ ان کی تقریر کا لب لباب حسب ذیل ہے۔

''ان مولوی صاحبان نے بھی کیسے مضحکہ خیز احکام بنا رکھے ہیں۔ وضو ہی کو دیکھئے۔ دن میں پانچ وقت ہاتھ منہ دھونا۔ پیر دھونا لازم کر رکھا ہے بھلا اس عروجِ صنعت کے زمانہ میں جبکہ آدمی صبح سے شام تک سخت مصروف رہتا ہے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دن میں پانچ مرتبہ جوتے اتارے۔ موزے اتارے، وضو کرے تب کہیں نماز پڑھے۔ پھر موزے پہنے، جوتے پہنے اور اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو۔

پھر یہ بھی کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ پیشاب پائخانہ خارج تو اپنے مخرج سے ہوں اور دھوئے جائیں منہ ہاتھ۔ کلیاں کی جائیں۔ ناک دھوئی جائے بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ ان مقامات پر نجاست کیسے پہنچ جاتی ہے؟

مہذب اقوامِ عالم کو دیکھئے انہوں نے روشنی علم کو مشعلِ راہ بنایا، اور مذہبی ڈھکو سلوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ وہ ترقی کی بامِ بلند پر پہنچیں۔ ہم ہیں کہ اسی تاریک غار میں پڑے ہیں جس میں ہزار برس قبل تھے۔ نہ کبھی ترقی کی فکر کرتے ہیں اور نہ کبھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس غار سے نکل کر دیکھیں کہ دنیا کس قدر وسیع ہے اور کیا کر رہی ہے۔

اگر مسلمان ان ہی مذہبی ڈھکوسلوں اور خلافِ عقل عقیدوں میں پھنسے رہے تو ذلت و خواری کے تاریک غار سے کبھی نکل نہ سکیں گے۔ دنیا آگے بڑھ رہی ہے،

مسلمان پیچھے ہٹ رہے ہیں۔قومیں بلندی پر چڑھ رہی ہیں، یہ پستی میں گر رہے ہیں۔ افسوس ہے ان کی عقلوں پر۔ یہ تمام مذہبی ڈھکوسلوں اور تنگ نظر مولویوں کی بدولت ہے۔

زمانہ برابر ترقی کررہا ہے مگر مسلمان ہیں کہ تیرہ سو برس پرانے قانون وضوابط پر عمل پیرا ہیں۔اُس وقت لوگ اونٹ، گھوڑے، گدھے، خچر، بیل گاڑی پر سفر کرتے تھے۔اب ریل، ٹرام، موٹر کار، ہوائی جہاز ذریعہ سفر ہیں۔اگر کوئی شخص اِس زمانہ میں بھی اُن ہی پرانی سواریوں کو استعمال کرے اور جدید ذرائع سفر سے متنفر ہو تو اُس کو لوگ کیا کہیں گے۔ مجھے تو یقین ہے کہ ایسے شخص کو سب جاہلِ مطلق کا خطاب دیں گے مگر افسوس ہے مسلمانوں کی عقلوں پر کہ اِس زمانہ عروج وتہذیب میں بھی اپنی زندگی کا سفر اُسی پرانے اونٹ کے پالان پر گزارنا چاہتے ہیں اور جدید طرزِ معاشرت سے نفرت کرتے ہیں۔ پھر اپنے آپ کو صاحبِ فہم وشعور جانتے ہیں۔ یہ سبب ہے کہ صُمٌّ بُکمٌ عُمْیٌ کے مِصداق بنے ہوئے ذلت وخواری کے تاریک غار میں پڑے ہیں''۔

عرض کیا گیا کہ جناب کا لیکچر ختم بھی ہوگا یا جاری ہی رہے گا؟ کہنے لگے:۔

''یہی بہت ہے۔ صاحبانِ فہم کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی معقول جواب ہو تو فرمائیں ورنہ وقت فضول ضائع نہ کریں''۔

بندے نے عرض کی کہ اگر میرے معروضات کو آپ بھی اسی صبر وسکون سے سنیں جیسے میں نے آپ کا وعظ سنا تو البتہ کچھ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں۔اس پر وہ رضامند ہو گئے تو بندۂ حقیر نے عرض کرنا شروع کیا۔

الجواب بعون الوہاب

ایک شخص ایک طبیبِ حاذق کے پاس گیا۔نبض دکھلائی بیماری کا حال بیان کیا طبیب نے غور و خوض کے بعد نسخہ لکھ دیا اور کہا۔اس کو تین روز گھوٹ چھان کر پئیں ۔ پھر آ کر حال بیان کریں۔مریض صاحب نسخہ لے کر چلے گئے۔دوسرے دن پھر آ گئے۔کہنے لگے جناب مجھے تو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔طبیب نے پوچھا،آپ نے نسخہ استعمال کیا۔بولے جی ہاں۔حکیم صاحب نے کہا ابھی تو ایک ہی دن ہوا ہے۔دو روز اور استعمال کیجئے۔کہنے لگے پھر اور نسخہ دیجئے۔حکیم صاحب نے کہا،وہ نسخہ کہاں ہے جو کل دیا تھا۔کہا کہ وہ تو میں نے کل ہی گھوٹ چھان کر پی لیا تھا۔اب اور نسخہ دیں تو استعمال کروں۔حکیم جی مسکرائے اور کہا وہ کاغذ تو گھوٹ چھان کر پینے کا نہ تھا، بلکہ وہ دوائیں جو اس پر لکھی تھیں عطار کی دکان سے لے کر ان کو گھوٹ چھان کر پیتے تو فائدہ ہوتا۔وہ کاغذ کا پرزہ کیا فائدہ دے سکتا تھا۔

پس اگر کوئی شخص کسی طبیبِ حاذق کے نسخہ کو گھوٹ چھان کر پیتا رہے اور شکایت کرتا رہے کہ اس کو بالکل فائدہ نہیں ہوتا۔تو طبیب کا کیا قصور۔

اسی طرح مسلمان بھی قرآنِ حکیم کو جو انسان کے امراضِ روحانی دفع کرنے کا اکسیر نسخہ ہے گھوٹ چھان کر پینا ہی یعنی خوب ازبر پڑھ لینا اور حِفظ کر لینا ہی کافی سمجھتے ہیں لیکن جو دوائیں دفعِ امراض کے لئے اس میں لکھی ہوئی ہیں ان کو استعمال کرنا ضروری نہیں جانتے۔پھر اس کو رَٹ لینے اور بار بار اس کا وِرد کر لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔کیا کسی طبیب کا نسخہ اور ترکیبِ استعمال جو اس پر لکھی ہوئی ہے، پڑھتے رہنے سے کسی مرض کو افاقہ ہونا ممکن ہے۔

ہماری مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی آدمی سر پر چراغ رکھے پھر رہا ہو۔دوسرے لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتے ہوں مگر خود اس کو چراغ نظر نہیں آتا۔اگر کہیں ریت کا کوئی ذرہ چمکتا نظر آتا ہے جس پر اُسی چراغ کی روشنی پڑ رہی ہے جو اُس کے سر پر ہے تو اُس کی طرف دوڑتا ہے۔ایسی حالت میں چراغ کو بیکار سمجھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے؟

جب مسلمان قرآن پر عمل ہی نہ کریں۔ شارعِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہی نہ کریں تو اس میں اسلام اور قرآن کا کیا قصور؟ کیا قرآن نے تفکر و تعقل و تدبر کا حکم نہیں دیا؟ قرآنِ حکیم میں کتنی ہی آیات ہیں افلا تعقلون (کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے)۔ اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ (کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے)۔ جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ کا ارشاد ہے:۔

وَفِي الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَ ۝۲۰ وَفِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۝۲۱ الذاریات

اور زمین میں نشانیاں ہیں صاحبان یقین کے لئے اور خود تمہارے نفسوں میں۔ کیا تم دیکھتے نہیں۔

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِي الۡاٰفَاقِ وَفِيۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۝۵۳ فصلت

ہم اپنی نشانیاں ان کو دکھائیں گے کائنات میں اور خود ان کے نفسوں میں۔

اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ۝۱۷ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ۝۱۸ وَاِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ۝۱۹ وَاِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ ۝۲۰ الغاشیہ

کیا وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اونٹ کیسے خلق کیا گیا اور آسمان کیسے بلند کیا گیا اور پہاڑ کیسے نصب کئے گئے اور زمین کیسے بچھائی گئی۔

اور حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

تَفَكَّرُوا فِي خَلۡقِ اللہ (اللہ کی خلقت میں غور و فکر کرو)۔

یہاں تک فرمادیا:۔

تَفَكُّرُ سَاعَةٍ اَفۡضَلُ مِنۡ عِبَادَةِ سَنَةٍ (ایک گھنٹہ غور و فکر کرنا ایک سال کی عبادت سے افضل ہے)۔

ہم تو تاریکی ہی میں پڑے رہے۔ ہم نے اِس نُور سے کیا فیض حاصل کیا؟ اہلِ مغرب نے اِس نُور کی روشنی سے فائدہ اٹھایا۔ کائنات میں غور و فکر کیا۔ فطرت کے راز اُن پر منکشف ہونے لگے۔ انہوں

نے فطرت کی طاقتوں سے کام لیا۔ زمین سمندر اور ہوا پر ان کو تسلط حاصل ہوگیا۔ اِس وقت تمام مشرقی دنیا مغرب کی مادی طاقتوں سے مرعوب ہوگئی ہے۔ جس کے باعث ان کے عیوب بھی ہنر نظر آتے ہیں۔ نفسِ انسان کو اس کی جدت پسندی کے سبب اور مرعوب ہوجانے سے تمدنِ مغرب مرغوب ہوگیا ہے۔ اس لئے دلائل فاسدہ سے اس کی تائید کی جاتی ہے۔

اِس وقت سے ہزار ہا سال قبل کے حالات معلوم کریں تو یہی پتہ چلے گا۔ اُس وقت بھی انسان کے دو ہاتھ۔ دو پیر، دو آنکھیں، ایک ناک، دو کان اور ایک سر تھا۔ اور اب بھی وہی ہیں۔ زمانہ بدلنے سے ضروریات وتکلفات بڑھ گئے مگر جسمِ انسان میں تو کسی جدید عضو کا اضافہ نہ ہوا۔ نہ کسی عضو نے ترقی کر کے صورت بدلی۔ کیا زمانہ بدلنے اور علومِ جدیدہ کے رائج ہونے سے نفسِ انسان میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ کیا نفس کے خواہشات وجذبات واحساسات میں کوئی تغیر ہوا ہے۔ جب نفس میں اور جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو جو قوانینِ فطرت ہزار ہا سال قبل مفید تھے وہی اب بھی مفید ہوں گے۔ اگر کسی خلافِ فطرت عمل سے ظاہراً کوئی فائدہ نظر بھی آئے تو عارضی ہی ہوگا۔ آخر انجام اس کا ہلاکت وتباہی ہی ہوگا۔

اِس وقت سے ہزار ہا سال قبل کے حالات معلوم کریں تو یہی پتہ چلے گا۔ اُس وقت بھی انسان کے دو ہاتھ۔ دو پیر، دو آنکھیں، ایک ناک، دو کان اور ایک سر تھا۔ اور اب بھی وہی ہیں۔ زمانہ بدلنے سے ضروریات وتکلفات بڑھ گئے مگر جسمِ انسان میں تو کسی جدید عضو کا اضافہ نہ ہوا۔ نہ کسی عضو نے ترقی کر کے صورت بدلی۔ کیا زمانہ بدلنے اور علومِ جدیدہ کے رائج ہونے سے نفسِ انسان میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ کیا نفس کے خواہشات وجذبات واحساسات میں کوئی تغیر ہوا ہے۔ جب نفس میں اور جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو جو قوانینِ فطرت ہزار ہا سال قبل مفید تھے وہی اب بھی مفید ہوں گے۔ اگر کسی خلافِ فطرت عمل سے ظاہراً کوئی فائدہ نظر بھی آئے تو عارضی ہی ہوگا۔ آخر انجام اس کا ہلاکت وتباہی ہی ہوگا۔

یہ تو فرمائیے کہ آپ اپنی دقیانوسی شکل وصورت کیوں نہیں بدلتے۔ اپنے نفس میں بھی ترمیم کیوں

نہیں کرتے۔ جب جسم و نفس ہزار ہا سال پرانے دقیانوسی ہیں تو قوانین پرانے دقیانوسی کیوں مفید نہ ہوں گے۔

اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کبھی بدلتی نہیں۔ ابتدائے عالم سے اِسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ⑬ شوریٰ

تمہارے لئے دین کی وہ راہ مقرر کی ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کیا اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا۔ ابراہیمؑ وموسیٰ اور عیسیٰ کو۔

یہی قدیمی دین ہے۔ اس کے قوانین کبھی نہیں بدلے۔ جب فطرت نہیں بدلتی تو قوانین بھی نہیں بدل سکتے۔ البتہ نظام ظاہری کی صورت ضرورت زمانہ کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ اصل قانون میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ضرورت ہی پیش آئی۔

ان ہی قوانین کے منجملہ ایک وضو بھی ہے۔ اس کے کچھ فوائد واغراض ومقاصد جو اس حقیر کے ذہنِ ناقص میں ہیں سن لیجئے۔ اگر عین مطابقِ عقل وفطرت ہوں تو پھر تسلیم کرلیں کہ اسلام کی مثل کوئی دوسرا راستہ مادی اور روحانی ترقی کا نہیں مل سکتا۔

سنیے، تندرستی کے لئے آلاتِ ہضم کا درست رہنا نہایت ضروری ہے ان میں سب سے پہلا آلہ مُنہ ہے جس میں دانت زبان، تالو، مسوڑے سب شامل ہیں۔ دانتوں کا کام تو واضح ہے۔ دانت اگر غذا کو اچھی طرح نہ پیسیں گے اور وہ خوب چبائی نہ جائے گی، اچھی طرح ہضم نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا دانتوں کی صفائی اور حفاظتِ صحت کے لئے نہایت ضروری ہے جس کے لئے شارعِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسواک کا حکم دیا ہے۔ نیز حکم ہے چھوٹا لقمہ لو اور اس کو خوب چبا کر نگلو۔

جبڑوں کے نیچے کچھ غدود ہیں جن سے کھانا کھاتے وقت لعاب آتا ہے جو زبان اور تالو کے مسامات سے نکلتا ہے اور غذا کے ساتھ شامل ہو کر اس کو لائقِ ہضم بناتا ہے۔ بغیر اس کے ہضمِ تام نہیں

ہوسکتا۔

نیز جب قبض ہوجاتا ہے تو زبان پر کانٹے پڑ جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر خشکی آجاتی ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان اور ہونٹوں کا معدہ سے خاص تعلق ہے۔ زبان کو رگڑ کر صاف کرنا معدہ کو قوت پہنچاتا ہے۔اب تو واضح ہوگیا کہ وضو میں کلی کرنا، منہ کو صاف کرنا کس قدر مفید ہے۔

اب دیگر اعضائے وضو کا آلاتِ ہضم سے تعلق ملاحظہ فرمائیں۔ جب آنتوں میں خشکی ہوجاتی ہے اور سخت قبض ہوجاتا ہے تو ناک میں گرمی، آنکھوں میں جلن سی، چہرہ کی جلد پر سوزش، ہاتھوں اور کلائیوں کے مسامات میں خفیف حدت محسوس ہوتی ہے۔ چہرہ تمتما جاتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آلاتِ ہضم سے ان مسامات کا خاص تعلق ہے۔

اسی طرح رات کو نہ سونے سے بھی ایسی ہی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے۔ اب غور کرلیں کہ پیشاب پاخانہ یا ریح کے خارج ہونے یا سوجانے سے ان مسامات پر کوئی خاص اثر ضرور پڑتا ہے۔ان ہی امور کے واقع ہونے سے وضو ساقط ہوجاتا ہے۔

یہ تو وہ امور ہیں جو مجھ جیسے جاہل کے خیال میں صحتِ جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں۔اب کچھ صحتِ روحانی کے متعلق بھی سنئے۔

یہ حقیقت اب روشنی میں آچکی ہے کہ نفسِ انسان سے غیر مرئی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں جو ماحول پر اثر انداز ہوتی ہیں۔اس کے متعلق ہپناٹزم کے عامل کو دیکھئے۔اس کو بھی آنکھوں سے، چہرہ اور ہاتھوں سے کام لینا ہوتا ہے۔معمول کی طرف منہ کرکے اس کو بغور دیکھتا رہتا ہے ہاتھوں سے اشارے کرتا ہے۔اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعضائے وضو ہی سے مؤثر شعاعیں نکلتی ہیں۔

جو لوگ علوی عمل سے کسی مؤکل کو مسخر کرلیتے ہیں۔ان کو ہر وقت باوضو رہنا پڑتا ہے۔اسقاطِ وضو کے بعد موکل پر قابو نہیں رہتا ہے۔عامل کی قوتِ ارادی کی شعاعیں موکل پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔

اب حیاتِ اجتماعی میں وضو کے فوائد دیکھیں۔ دنیا میدانِ جنگ ہے یہاں انسان دشمنوں میں

گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وقت کی قدر کرے۔ چستی اور پھرتی پیدا کرے۔ جس وقت بھی کسی دشمن کے حملے کا اندیشہ ہو فوراً دفاع کے لئے تیار ہو جائے گروہ کا مقابلہ گروہ ہی کر سکتا ہے اور نفسِ انسان کی فطرت ہے کہ یہ کوئی کام بغیر عادت مشکل سے ہی کرتا ہے یا کر ہی نہیں سکتا۔

لہٰذا اپنی جماعت کی حفاظت کے لئے خطرہ کے وقت ایک آواز پر تیار ہو جانے کی عادت ہونی چاہئے۔ جیسا کہ بگل کی آواز پر فوج موزے، جوتے، وردی پہن کر تیار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ مشق ہونی چاہئے کہ اذان کی آواز سنتے ہی چند منٹ کے اندر اندر موزے اتاریں، جوتے اتاریں اور جماعت کے لئے تیار ہو جائیں۔

پس اگر یہ خوبیاں کسی کو نظر نہ آئیں اور مسلمان ان سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اسلام اور شارع اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس میں کیا قصور ہے۔

مجھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے حال پر سخت افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ایسے عظیم الشان اور کثیر الفوائد فطری دین کو اپنی بے عملی سے بے سود بنا رکھا ہے۔ دنیا قوانینِ اسلام پر عمل کر کے مستفید ہو رہی ہے اور مسلمان فروعی مسائل پر ہی جھگڑ رہے ہیں اور فرقہ بندی کی بلا میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم و کرم سے ہمیں توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

عبادت

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ اپنے کلام پاک میں ارشادفرماتا ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾ الذاریات

اورنہیں پیدا کیا ہم نے جنوں اور انسانوں کومگر اس لئے کہ وہ سب ہماری عبادت کریں۔

اس آیہ وافی ہدایہ پر شک کرنے والوں کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خالق نے تمام جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے خلق کیا اور ظاہر ہے کہ بہ کثرت افراد عبادتِ خالق نہیں کرتے تو مقصدِ خلقت پورا نہیں ہوتا اور اہلِ عالم کے عبادت سے روگرداں ہونے کا ثبوت خود قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ﴿۶۲﴾ یاسین

اے بنی آدم کیا ہم نے تم سے عہد نہ لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھی راہ ہے اور البتہ تم میں سے بہت سوں کو اس نے گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بہ کثرت انسان بندگیٔ شیطان میں مصروف رہتے ہیں اور مالک کی بندگی نہیں کرتے حالانکہ خالق نے ان کو اپنی بندگی کے لئے بنایا تھا۔ اس سے صنعت کا نقص ظاہر ہوتا ہے ورنہ اگر صنعت کا نقص نہ ہوتو ممکن نہیں جو چیز جس کام کے لئے بنائی جائے اس سے وہ مقصد حاصل نہ ہو۔

بعض مفکرین کی طرف سے اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں، اس میں

الف لام موجود ہے اور یہ تخصیصی ہے نہ کہ جنسی۔ یعنی اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''نہیں پیدا کیا ہم نے کچھ خاص جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ ہماری عبادت کریں''۔

اگر آیت کا یہی مفہوم ہو تو اس پر یہ ایراد ہوتا ہے کہ جب کچھ افراد کو عبادت کے لئے پیدا کیا تو کیا باقی نافرمانی کے لئے خلق کئے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو باقی تمام جن وانس اگر عبادت سے روگردانی کریں تو مقصدِ خالق کو پورا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو تو عبادت کرنی ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ وہ تو اس کام کے لئے بنائے ہی نہیں گئے۔

اس تمام بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ محض تاویل فاسد ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ **یعبدون** سے مراد **یعرفون** ہے یعنی ''ہم نے جن وانس کو اس لئے بنایا ہے کہ ہمیں پہچانیں''۔ تو کوئی شخص ایسا نہیں کہ اللہ کے وجود کا انکار کرسکے۔ مگر یہ بھی قیاسی تاویل ہے۔ دہریہ اور نیچری دنیا میں بہ کثرت موجود ہیں جو وجودِ خالق کے منکر ہیں۔ **یعرفون** سے بھی مطلب حل نہ ہوا۔

ان تاویلات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رائے اور قیاس پر مبنی ہیں۔ آیہ وافی ہدایہ سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن تو یہی کہہ رہا ہے کہ ''ہم نے تمام جن وانس کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ سب کے سب ہماری عبادت کریں''۔

لوگوں کی عادت ہے کہ قرآن میں تدبر وتفکر کر کے اس کا اصل مفہوم تو سمجھنے کی کوشش کرتے نہیں۔ جو مفہوم خود ان کے ذہن نشین ہوتا ہے اس پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور وساوس پیدا ہوتے ہیں تو قیاس آرائی شروع کردیتے ہیں اور اپنے نفس کو تسکین دینے کے لئے تاویلات وتصویلات میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ مگر قرآن رائے اور قیاس سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک تدبر وتفکر نہ کریں اور عقل وفطرت کی طرف توجہ نہ کریں۔ قرآن کا مفہوم سمجھنا قریب قریب ناممکن ہے۔

وساوس کا مفصّل جواب

نفسِ انسان کی عادت ہے جو الفاظ سنتا رہتا ہے۔ ان کا کچھ نہ کچھ مفہوم ذہن میں قائم کر لیتا ہے اور جب کسی لفظ کا مفہوم ذہن میں قائم ہو گیا پھر کبھی اس کے حقیقی معنی کی تلاش وجستجو نہیں کرتا اس لئے کہ جب بھی کسی کو وہ لفظ بولتے سنتا ہے تو اس کا خیال اُسی مفہوم کی طرف جاتا ہے جو پہلے سے ذہن میں موجود ہے۔

اب غور فرمائیں کہ لفظِ ''عبادت'' سننے سے ہمارا ذہن کس طرف منتقل ہوتا ہے اور بچپن سے اس وقت تک اس کا مفہوم سمجھنے میں ہم نے کس قدر تدریجی ترقی کی ہے۔

اوّل اوّل جب کسی سے سنا خدا کی عبادت واجب ہے تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ جب یہ کہتے سنا کہ ہم سے کیا عبادت ہوسکتی ہے۔ خدا کی عبادت تو اولیاء اللہ کیا کرتے تھے۔ دن کو روزہ رکھتے۔ رات بھر نماز ودعا وتلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ اب نفس نے جانا، نماز وروزہ، اَوراد ووظائف وغیرہ کو عبادت کہتے ہیں۔ جب کچھ اور شعور ہوا تو جانا کہ حج وزکٰوۃ، ذکر اللہ اور اس کی یاد میں تکالیف اٹھانا بھی عبادت ہے۔ اس سے زیادہ کچھ سنا ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا مفہوم حقیقی سمجھنا کس طرح ممکن تھا۔

الفاظ کا غلط یا ناقص مفہوم ہی شکوک و وساوس کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا ناواقف لوگوں کو غلط فہمی سے نکالنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ لفظ ''عبادت'' کی ایسی تشریح کر دی جائے کہ اس کا حقیقی مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ سکے۔

عبادت کی تشریح

اگر عبادت کے معنے بس نماز پڑھنا، رکوع کرنا، سجدہ کرنا، روزہ رکھنا ہی ہوں تو لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ (شیطان کی عبادت نہ کرنا) سے کیا مراد ہوسکتی ہے کیا کوئی شیطان کے لئے نمازیں پڑھتا ہے؟ کیا کوئی شیطان کو سجدہ کرتا ہے؟ نہیں، اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ عبادت کا حقیقی مفہوم نہیں ہے۔اب ضرورت ہے کہ اس کے مفہومِ حقیقی کی جستجو کریں۔

''عبادت'' کے لغوی معنی ''بندگی کرنا'' ہے مگر اس سے تو ہمیں کچھ علم حاصل نہ ہوا یوں سمجھ لیں کہ عبادت کے معنی ہیں عبد کے فرائض ادا کرنا۔اس سے بھی کچھ پتہ نہ چلا۔اچھا پہلے یہ معلوم کریں کہ عبد کس کو کہتے ہیں، غلام کو۔مگر اب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ''غلام'' کس کو کہتے ہیں، وہ شخص جو آزاد نہ ہو۔مگر یہ تو تمام کے تمام الفاظ ہی ہیں مفہوم کا پتہ نہیں چلتا۔اچھا یوں سمجھیں کہ ''غلام'' اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی ذات کا خود مالک ومختار نہ ہو بلکہ کسی غیر کو اس کی ذات پر حقِ تصرف مالکانہ حاصل ہو۔

پس واضح ہوگیا کہ ''عبد'' اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی ذات پر اختیارِ کُلی نہ رکھتا ہو، بلکہ کوئی اور شخص اس کا مالک ہو جس کو اس کی ذات پر مالکانہ تصرف کا حق اور اختیار ہو۔

غرض یہ کہ عبد مملوک کو کہتے ہیں تو پھر ''معبود'' کس کو کہیں گے۔یہ امر تو اب واضح ہوگیا کہ کسی عبد کا معبود اس ذات کو کہیں گے جس کو اس عبد پر تصرفِ مالکانہ کا حق اور اختیار حاصل ہو مگر چونکہ اصطلاحِ شرعی میں لفظِ ''معبود'' مالکِ حقیقی کے لئے مخصوص کرلیا گیا ہے لہٰذا کسی غلام کے آقا کو، کسی مملوک کے مالک کو اس کا معبود نہیں کہتے۔حالانکہ لغوی معنی کے اعتبار سے ہر آقا اپنے عبد کا معبود ہوتا ہے۔

عبد و معبود کے معنی واضح ہوجانے کے بعد ''عبادت'' کا مفہومِ حقیقی سمجھنا بھی دشوار نہیں رہتا۔ اس کیلئے صرف اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ غلام کا کام کیا ہے۔عبد کے فرائض کیا ہیں اور غلامی عبدیت یا بندگی میں کیا کیا کام داخل ہیں۔اس کیلئے تمثیلاتِ ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

تمثیل نمبر ۱

ایک مردِ مفلس وضعیف تنِ تنہا زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کو اپنی تمام ضروریاتِ زندگی خود ہی مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ بازار سے سودا خرید کر لانا۔ کھانا پکانا۔ رہائشی مکان کی صفائی کرنا۔ کنوے یا دریا یا نل سے پانی لانا۔ اسباب وظروف اور جملہ سامانِ خانہ داری کی صفائی اور اُس کو ترتیب سے رکھنا۔ بستر بچھانا پھرتہ کرنا۔ غرضیکہ وہ تمام کام جو زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں، اپنے ہاتھ سے کرتا ہے۔

اب فرض کیجئے کسی کریم النفس صاحبِ ثروت کی نظرِ ترحم اُس ضعیف بے کس پر پڑ گئی اور دریائے کرم جوش میں آ گیا اور اس کو ایک غلام ہبہ کر دیا۔ اب یہ ناتواں بوڑھا اُس غلام کا آقا ہو گیا۔

اب غور فرمائیں کہ اُس غلام کی بندگی میں کیا کیا کام داخل ہوں گے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ تمام کام جو آقا اپنی ذات کے لئے خود بہ نفس نفیس انجام دیتا تھا۔ اب اُس غلام کو آقا کے لئے کرنے چاہئیں۔ اس غلام کی عبادت ہوگی۔ اب عبادت کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ میں آیا یعنی ''عبادت'' کے معنے یہ ہوئے کہ آقا کے کرنے کے کام آقا کی نیابت میں اس کے لئے بندہ انجام دے۔ یہی ہر عبد کی عبادت ہے۔ آئندہ تمثیل سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

تمثیل نمبر ۲

ایک ملک التجار نے ایک غیر آباد جزیرہ کسی حکومت سے خریدا۔ جس کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ ایکڑ ہے۔ اگر اس کو آباد کیا جائے تو ضروری ہے کہ تقریباً ہزار بارہ سو ایکڑ اراضی مرکزی آبادی کے لئے رکھی جائے۔ جس میں مالک کے رہائشی مکانات، پارک، سیر گاہیں، مویشی خانے، چراگاہیں، دفاتر وغیرہ۔ اہل عملہ کیلئے کوٹھیاں وغیرہ، ملازم پیشہ، اہل حرفہ اور مزدور پیشہ لوگوں کے رہائشی مکانات ان کے مویشی خانے، درسگاہیں، تربیت گاہیں، صنعتی کارگاہیں، دکانیں اور بازار وغیرہ ہوں۔ باقی اراضی کو حسبِ موقع تخمیناً دو دو سو یا پونے دو دو سو ایکڑ کے قطعات پر تقسیم کر کے چھوٹے چھوٹے مواضعات آباد کئے جائیں۔ اتنی بڑی ریاست کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر کام کا شعبہ علیحدہ ہو۔ تمثیلاً چند حسب ذیل

ہیں:

① محکمہ انجینئرنگ، جس کی زیر نگرانی تعمیرات سڑکیں، باربرداری کی گاڑیاں، مشینیں، موٹر کاریں، لاریاں وغیرہ رکھی جائیں۔

② محکمہ بندوبست و پیمائش اراضی وغیرہ۔

③ محکمہ حساب کتاب ودفاتر وغیرہ۔

④ محکمہ حفظان صحت۔

⑤ محکمہ تعلیم۔

⑥ محکمہ صنعت وحرفت۔

⑦ محکمہ امن عامہ پولیس وغیرہ۔

⑧ زراعت وآبپاشی وغیرہ۔

⑨ محکمہ امور خارجہ وخرید وفروخت از بیرونجات (بیرون ملک)۔

⑩ محکمہ انتظام ونگرانی تحصیل وصول پیداوار وغیرہ ودیگر امثال۔

اس قدر وسیع تعلقہ کو آباد کرنے کے لئے کئی ہزار آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ جن میں ہر ایک مالک کا مطیع وفرمانبردار ہو۔ اس قدر جماعتِ کثیر اسی صورت میں مہیا ہوسکتی ہے کہ کچھ زرخرید غلام ہوں۔ باقی ایسے حاجت مند ہوں جو معاہدے پر دستخط کرکے عارضی یا دائمی خط غلامی لکھ دیں۔ جتنے غلام دستیاب ہوتے رہیں۔ اسی نسبت سے دیہات آباد کرتے جائیں۔ ہر قطعہ یا موضع میں تقریباً ایک ثلث اراضی کاشتکاروں کے رہائشی مکانات، مویشی خانوں، چراگاہوں، شاگرد پیشہ جماعتوں کے مکانات کے لئے رہے۔ اسی میں منتظمین کے لئے بھی مکانات وقیام گاہیں وغیرہ ہوں۔ باقی اراضی ساٹھ ساٹھ ستر ستر بیگھے کے کھیتوں میں تقسیم کردی جائے۔ اب تقسیم کار وانتظامِ کاشت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ تین تین چار چار غلاموں کے علیحدہ علیحدہ گروہ بنا دیے جائیں۔ کچھ

دودھ دینے والے جانور ایک دو جوڑ بیل، ایک دو ہل اور ضروری آلاتِ کاشت ان کو مستقلاً دے دیے جائیں۔ اور ساٹھ ساٹھ ستر ستر بیگھے اراضی ہر گروہ کو کاشت کے لئے دے دی جائے۔ اس صورت میں ہر موضع میں تمام کام کی نگرانی دو تین آدمی بخوبی کر سکتے ہیں۔

اگر اراضی، مویشی، آلاتِ کاشت وغیرہ اس طرح تقسیم کر دیئے گئے تو ہر گروہ کو دوسرے کے مقابلہ کا خیال پیدا ہوگا۔ ایک گروہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے گا۔ جو محنتی نہ ہوں گے ان کو رشک وحسد پیدا ہوگا۔ وہ اپنا کام بہتر دکھلانے کی غرض سے دوسروں کا کام خراب کرنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا سیاست وتدبر کی ضرورت ہوگی۔

اگر مالک یہ اعلان کر دے کہ سال کے آخر میں سب کے کام کا جائزہ لیا جائے گا۔ جس کا کام اچھا ہوگا، انعام پائے گا اور جس کا خراب ہوگا اس کو سزا دی جائے گی۔ پس سست وکاہل سزا کے خوف سے اور جفاکش انعام کے لالچ میں خوب کام کریں گے مگر ان ہر دو گروہ میں کیا کوئی مالک کے دل میں اپنی وقعت پیدا کر سکتا ہے۔ نہیں۔ ایسے غلام مالک کی خوشنودی اور تقرب حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض ان میں ایسے بھی ہوں گے جو مالک کی محبت اور وفاداری کے جذبہ سے سرشار ہو کر کام میں مستغرق رہیں گے۔ ان کو کسی سے حسد ہوگا نہ رشک بلکہ وہ تو مالک کی محبت کی وجہ سے اس کی املاک میں کہیں بھی نقصان ہوتا دیکھیں گے تو اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑیں گے اور املاک کو نقصان سے بچانے کی کوشش کریں گے خواہ وہ جگہ ان کی ذمہ داری کے حدود میں ہو یا نہ ہو۔ نہ ان کو انعام کا لالچ ہوگا نہ سزا کا خوف۔ یہاں تک کہ یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ اگر مالک کی اس چیز کو ہم نقصان سے بچالیں گے تو اس کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ بلکہ وہ تو جذبہ وفاداری اور محبت میں سرشار ہونے کی وجہ سے ایسا کریں گے۔ ایسے ہی غلام وہ ہوں گے جو مالک کی نظر میں خاص وقعت حاصل کر لیں گے۔

مسلمانو! بے مثل ومثال آقا کے غلامو! ذرا غور کرو اور سوچو کہ مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے۔ کیا بخوفِ عذاب بندگی کرنے سے اس کی رضا حاصل کر سکتے ہو۔ معبودِ حقیقی کے بندو! کیا انعام کے لالچ میں بندگی کرنے سے اس کی خوشنودی میسر ہو سکتی ہے؟ نہیں۔

ہاں اگر مالک سے محبت ہے تو بالکل بے غرض ہوکر بندگی کرو۔ اس کی املاک میں کہیں بھی نقصان ہوتا دیکھو اور جان پر کھیل کر اس کو بچانے کی کوشش کرو تو البتہ مالک کی خوشنودی حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر ڈر سے کام کیا اور نفس خائف ہونے کی وجہ سے تم سے کام لیتا ہے تو یہ کام نفس کے حکم سے ہوا۔ لہٰذا بندگی خالص نہ ہوئی بلکہ نفس اس میں شریک ہوگیا۔ اگر انعام کے لالچ میں کیا تو نفس کو لذات کی خواہش نے مجبور کیا۔ اس نے تمہیں مجبور کرکے کام لیا۔ اس میں بھی وہ شریک ہوگیا۔ لہٰذا یہ بندگی بھی خالص نہ ہوئی۔

خالص بندگی تو وہ ہی ہوگی جس میں خواہشات وجذباتِ نفس کی شمولیت نہ ہو۔ بلکہ خوف ولالچ سے بے نیاز ہوکر محض مالک کی محبت میں بندگی بجالائیں۔ اس کا ثبوت خود خالق کے کلام میں موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ المائدہ — اللہ تو صرف متقیں ہی سے قبول کرتا ہے۔

اور یہی قربانی کے ذکر میں ارشاد فرمایا:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا — اللہ کو ہرگز نہیں پہنچتا اس کا گوشت اور نہ اس کا خون۔

وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴿۳۷﴾ الحج — اس کو تو صرف تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

یعنی وہ خلوص جو تمہارے دلوں میں خدا کے لئے ہوتا ہے۔ صرف وہی اس کو پہنچتا ہے۔

اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے۔ کوئی عمل بھی ہو اگر وہ خالصتاً بوجوہ اللہ نہیں کیا گیا تو فائدہ پہنچانے والا نہیں۔ نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ، ایثار، سخاوت، رحم وکرم، ہمدردی، خدمت خلق غرضیکہ کوئی عملِ خیر جس میں ہماری نفسانی خواہشات واغراض کی شمولیت ہو لائقِ ستائش نہیں ہوتا۔ تمام عبادات جن میں خلوص نہ ہو اور محض خدا کے لئے نہ ہوں، ناقص ہیں۔

اس کے علاوہ پہلے اس پر غور کریں کہ خدا تو نماز نہیں پڑھتا۔ روزہ نہیں رکھتا اور درود ووظائف میں مصروف نہیں رہتا۔ نہ یہ اس کے کام ہیں۔ پھر ان کاموں کو ہم نے عبادتِ حقیقی کیسے سمجھ لیا۔ یہ ریاضاتِ نفس ہیں جو عبادتِ حقیقی کا اہل بنانے کے لئے لازم قرار دی گئی ہیں چونکہ خالق نے ان ہی کے

بجالانے کا حکم دیا ہے اور یہی عبادتِ حقیقی تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں لہٰذا داخلِ عبادت اور عبادتِ مجازی ہیں حقیقی عبادت تو وہی اعمال ہو سکتے ہیں جن سے مالک کی صفات کا ظہور ہو اور اس کی نیابت میں محض اس کی خوشنودی کے لئے عمل میں آئیں۔ ان کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

① وہ خالق ہے تو کبھی ایسا نہیں کرتا کہ آسمان سے آدمی برسا دے یا زمین پھٹے اس میں سے نکل آئیں بلکہ اس نے اپنی سنت یہ مقرر فرمائی ہے کہ لوگ عقد کریں اور بچے پیدا ہوں۔ پس اگر یہ سب کام خوشنودیٔ خالق کے لئے کئے گئے اور صفتِ خالقیت کا حجاب بننے کے لئے ہوئے تو عبادتِ حقیقی ہیں اور اگر خواہشات وجذبات نفسانی کی تسکین کے لئے ہوئے تو بندگیٔ نفس اور شرکِ خفی ہیں۔

② وہ رَب ہے، تمام عالموں کو پالنے والا ہے۔ اس نے بچوں کی پرورش کے لئے ماں باپ کو حجاب مقرر فرمایا ہے۔ اگر بچوں کی پرورش محض ربّ العزت کی خوشنودی کے لئے کی جائے، اس کی امانت جان کر ان کی خدمت ونگرانی کریں تو عبادتِ حقیقی ہوگی اور اگر جذبہ حیوانی کی تسکین کے لئے ہو تو بندگیٔ نفس۔

③ وہ رازق ہے تمام مخلوق کو رزق پہنچانا اس کا کام ہے حصولِ معاش کی کوشش کرنا صفتِ رازقیت کا مظہر بننا ہے۔ اگر کسبِ معاش رضائے الٰہی کے لئے کیا۔ صنعت وحرفت، محنت، مزدوری وغیرہ میں اس کو مالک کا کام، اس کا فریضہ جانتے ہوئے مصروف رہا اور اس میں اپنی خواہشاتِ نفسانی شریک نہ ہوئیں تو یہ تمام کام عبادتِ حقیقی ہوں گے۔

④ ایک کاشتکار اپنی زراعت پر سخت محنت کرتا ہے تاکہ اس کو منافع حاصل ہو۔ دوسرا کاشتکار اس نیت سے محنت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلہ اُگائے، تاکہ لوگوں کے لئے اناج مہیا ہو سکے۔ پہلے کا کام اپنے نفس کی بندگی اور دوسرے کا عبادتِ حقیقی ہے۔

⑤ اسی طرح تمام کاروباری زندگی۔ اس کی دنیا کو رونق دینا۔ اس کے شہروں کو آباد کرنا، اس

کی مخلوق کی خدمت کرنا، اگر نام ونمود، عزت وشہرت کے حصول کے لئے ہیں۔ شرکِ خفی اور بندگیٔ نفس ہیں اور اگر رضائے معبود کے لئے ہوں تو عبادتِ حقیقی ہے۔

اِنّما الاعمال بالنّیات۔ (تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے)۔

مگر وائے برحال ما! جب اپنی حیاتِ دنیا کے ایک ایک عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو صرف آئندہ کے آرام وآسائش کے شوق یا آئندہ زندگی کی تنگ دستی اور پریشاں حالی کے خوف سے کام کرتے ہیں۔ رضائے الٰہی کی تلاش وجستجو کا تو کبھی ہمیں خیال تک بھی نہیں آتا۔ ہماری زندگی کا کوئی کام مالک کے لئے نہیں ہوتا بلکہ تسکینِ جذبات کے لئے ہوتا ہے۔ اگر مالک کی محبت میسر ہوجائے تو اعمال میں بے غرضی پیدا ہوجائے۔

افسوس کہ ہمیں دنیا کے مصائب وآلام وحوائج میں تو مالک یاد آتا ہے اور اس سے تڑپ کر دعائیں مانگتے ہیں۔ ادھر مشکل حل ہوئی فوراً ہی اس کو بھول جاتے ہیں۔

ہماری اس کیفیتِ نفسی کو مالک نے کھول کر بیان کردیا ہے:۔

وَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنۡۢبِهٖۤ اَوۡ قَاعِدًا اَوۡ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنۡ لَّمۡ يَدۡعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلۡمُسۡرِفِيۡنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾ یونس

اور جب انسان پر مصیبت پڑتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ لیٹے لیٹے، بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے پس جب ہم اس کی مصیبت دور کردیتے ہیں تو اپنی پہلی رفتار پر چلنے لگتا ہے۔ گویا کہ اس نے وہ مصیبت دور کرنے کو جو اس پر پڑی تھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح گنہگاروں کیلئے وہ عمل زینت دیئے گئے ہیں جو وہ کرتے تھے۔

افسوس کہ ہم بدنصیبوں کو یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ اس پیارے آقا کی محبت کا نور اس سے طلب کریں۔ اگر تڑپ تڑپ کر مانگیں تو مل جانا یقینی ہے مگر جب خواہش وطلب ہی نہ ہو تو ملے کیوں؟

پیغمبر اسلام صلٰوۃ اللہ وسلامہ علیہ تو اس واسطے آئے تھے کہ ہماری دنیا کو دین بنادیں۔ مگر ہم نے دین کو بھی دنیا بناڈالا اور ہمارے تمام اعمالِ مذہبی بھی خوف ولالچ کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ بن کر رہ

گئے۔حالانکہ یہی وہ ریاضاتِ نفس ہیں جو ہماری زندگی کے تمام اعمال وافعال کو عبادتِ حقیقی بنادینے کا ذریعہ ہیں۔

غرضیکہ ہماری حیاتِ دنیا کے تمام کام ان غلاموں کی طرح جن کا ذکر تمثیلاً اوپر گزر چکا خوف یا لالچ کے سبب سے ہوتے ہیں مگر غور طلب امر یہ ہے کہ یہ تمام غلام جو کاروبارِ ریاست مثل کاشتکاری، باغبانی وغیرہ میں مصروف ہیں، اور جو کام بھی ان کے سپرد کیا گیا ہے اس کو انجام دے رہے ہیں تو خواہ وہ سزا کے خوف سے کررہے ہوں یا انعام کے لالچ میں کام تو آقا ہی کا ہورہا ہے۔ بندگی تو مالک ہی کی کررہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس میں چونکہ ان کی خواہشاتِ نفس شریک ہیں لہٰذا مالک کی رضا اورتقرب حاصل نہیں کرسکتے۔آقا کی خوشنودی تو وہی غلام حاصل کرے گا جو مالک کی محبت میں سرشار ہوکر اس کی وفاداری کے جوش میں ہر شے کو اس کی ملک سمجھتے ہوئے کام کرے۔

ایک اور مثال سے یہ امر واضح ہوجائے گا۔فرض کرو ایک شخص نے کچھ غلام ایسی حالت میں خریدے کہ وہ بالکل بے ہوش تھے۔اسی حالت میں سب کو اپنے ایک باغ میں پہنچادیا۔ جہاں رہائشی مکانات، اسباب خوردونوش وغیرہ تمام ضروریات زندگی موجود تھیں۔ جب ان کو ہوش آیا اور تمام سامان مہیا پایا تو اس پر قابض ہوگئے اور جب یہ دیکھا کہ اس کی ملکیت کا کوئی مدعی نظر نہیں آتا تو تمام سامان کو اپنی ملک سمجھ لیا۔

باغ کو سینچنا، درخت لگانا، پودوں کی پرورش کرنا، اس کو رونق وترقی دینا شروع کیا۔مکانات کی مرمت ودرستی کرتے رہے مگر یہ سب کچھ اپنی ملک سمجھتے ہوئے کیا۔حالانکہ مالک کو کلی اختیار ہے جس وقت بھی وہ چاہے ان کو اس باغ سے کہیں اور منتقل کردے۔

ہرچند کہ ان کو کبھی یہ خیال نہ ہوا کہ ہم کسی آقا کے غلام ہیں۔نہ کبھی یہ خیال ہی آیا کہ یہ باغ یہ مکانات اور یہ تمام سامان کس کا ہے۔اگر یہ خیال کرتے کہ تلاش کریں اس کا مالک کون ہے اور وہ کیا چاہتا ہے تو مالک کو پالیتے اور اسی کی مرضی کے مطابق اس کی املاک میں تصرف کرنے سے اس کو خوشنودی بھی حاصل ہوجاتی۔

ہر چند کہ مالک کی جستجو نہ کی، اس کی مرضی کا علم ان کو حاصل نہ ہوا مگر کام تو اسی کا کیا۔ اس کی مِلک میں تصرف کیا۔ محنت کی، مکانات کی مرمت و درستی کی۔ باغ کو رونق دی، سینچا، پودے لگائے، ان کی پرورش کی۔ اس طرح بندگی تو مالک ہی کی کرتے رہے مگر نیت اپنے نفس کی بندگی کی تھی۔

اسی طرح تمام جن وانس بھی دنیا کے مال واسباب، مِلک واملاک، اولاد وازواج وغیرہ کو اپنا سمجھ کر اپنے خواہشات وجذبات کی تسکین کے لئے ان کی حفاظت ونگرانی، تربیت و پرورش کرتے ہیں۔ ان کو رونق وترقی دیتے ہیں۔ شب وروز محنت ومشقت میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کا مالکِ حقیقی کون ہے اور تمام ایسے افراد اپنی خواہش کی تسکین کے لئے کھاتے ہیں جس سے تربیتِ جسم ہوتی ہے جو دراصل مالک کا کام ہے۔ اپنے جذبات کی خاطر عقد کرتے ہیں۔ اولاد پیدا ہوتی ہے۔ کام خالق کا ہوتا ہے۔ محبتِ حیوانی کے جوش میں اولاد کی پرورش کرتے ہیں، کام رَب کا ہوتا ہے۔ تسکینِ جذبات کے لئے غلہ اُگاتے ہیں، کام رازق کا ہوتا ہے، عمارتیں، سیر گاہیں بناتے ہیں۔ باغ باغیچہ لگاتے ہیں۔ بستیاں بساتے ہیں۔ شہر آباد کرتے ہیں، راستے اور سڑکیں بناتے ہیں، نہریں نکالتے ہیں مگر ملک تو تمام مالک حقیقی کی ہے۔ اس لئے کام اسی کا ہو رہا ہے۔

غرضیکہ تمام جن وانس ہر دم و ہر لحظہ اسی کی بندگی میں مشغول ہیں۔ ان میں سے بعض جو اہل شعور ہیں سب کچھ اسی کے لئے کرتے ہیں۔ ان کو رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ باقی سب غفلت ولاشعوری میں اپنے نفس کی بندگی کرتے ہوئے شب وروز معبودِ حقیقی کی عبادت میں مصروف ہیں۔ یہ ان کی بدنصیبی ہے کہ ان مشقتوں کے باوجود مالک کی رضا ان کو میسر نہیں ہوتی۔

اب تو بالکل واضح ہو گیا کہ وَمَا خلقتُ الجنّ والانس الاّ لیعبدون کا کیا مطلب ہے۔ دوسرے مقام پر مالک نے اس مطلب کو زیادہ واضح فرما دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ آل عمران	اور جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سب اسی کی طاعت میں مصروف ہیں رغبت سے یا کراہت سے اور اسی کی طرف ان کی بازگشت ہے۔

اس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ تمام جن وانس عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اوراسی کی بندگی میں مصروف ہیں۔ پس جو برضاء ورغبت بندگی خالق بجالاتے ہیں مستحقِ رضائے الٰہی ہیں۔ اور جو باکراہ عمل کرتے ہیں یعنی اپنی خواہشات وجذبات کی ایذاء دفع کرنے کو کام کرتے ہیں وہ خوشنودی خالق سے محروم رہتے ہیں۔

اب پھر ناظرین کو تمثیل زیر بحث کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو کچھ اس وقت تک بیان ہوا وہ انتظام وانصرام ریاست میں تقسیم کار کی پہلی صورت کے متعلق تھا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ موضع میں مرکزی تنظیم قائم کی جائے اور تمام کام مختلف شعبوں میں تقسم ہوں۔ ایک مویشی خانہ ہو جس پر ایک شخص نگران ہو۔ آلاتِ کار کا ایک ذخیرہ بنایا جائے جس پر ایک شخص نگران ہو۔ تمام غلاموں کی ضروریات زندگی کے لئے ذخائر قائم کئے جائیں، جو ایک شخص کی نگرانی میں ہوں۔ اسی طرح کاشتکاری، باغبانی، آبپاشی وغیرہ کے لئے علیحدہ علیحدہ شعبہ جات ہوں۔ ہر شعبہ کا ایک شخص ذمہ دار ہو۔ جملہ منتظمین کی نگرانی کے لئے ایک ناظم عمومی مقرر کیا جائے۔ باقی تمام غلاموں کو ان کی استعداد واہلیت کے مطابق منتظمین کی ماتحتی میں دے دیا جائے اور تمام ریاست میں تحصیلیں قائم کی جائیں۔ جن میں سے ہر ایک پر ایک حاکم ہو۔ ہر تحصیل میں آٹھ آٹھ دس دس موضعے شامل ہوں۔ اسی طرح تین تین چار چار تحصیلوں سے ایک ضلع بنایا جائے جس پر ایک ضلعدار منتظم ومتصرف ہو۔ اب ایک ناظمِ اعلیٰ کی بھی ضرورت ہوگی جو تمام ضلع داروں کے کام کی نگرانی کر سکے۔

ان تمام عہدیداروں کے علاوہ ایک جنرل سیکرٹری یا مختارِ عام کی ہر حالت میں ضرورت ہے جو تمام منتظمین وعمال کے کام کی نگرانی کر سکے۔ نیز خارجی معاملات کے لئے جہاں مالک اپنی جلالت قدر کی وجہ سے نہیں جاسکتا۔ اس کی نیابت بجالائے ایسا شخص وہی ہوسکتا ہے جو تمام کاموں سے واقف اور ہر محکمہ کے حالات سے باخبر ہو۔

اس کے علاوہ مالک کے مزاج، اس کی مرضی اور نجی حالات سے کماحقہ آگاہ ہو۔ تاکہ جب کسی دوسری ریاست میں مالک کی طرف سے کوئی معاملہ طے کرنے جائے تو مالک کی مرضی اور اس کے

خیالات کے مطابق رائے قائم کر کے معاملہ طے کر سکے اور ایسا شخص ہر حال میں درکار ہو گا اور غلاموں ہی میں سے منتخب کیا جائے گا۔

لہٰذا حدودِ ریاست میں آباد شدہ غلاموں میں ایسے آدمی بھی ہونے چاہئیں جن کے قوائے ذہنی کی اتنی تربیت ہو گئی ہو کہ سیاست کی گتھیاں اچھی طرح سلجھا سکیں جس کے لئے اچھے خاصے تعلیم یافتہ اشخاص کی ضرورت ہے۔ اور ایسے اشخاص غلاموں ہی میں سے بننے چاہئیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہر غلام پر کچھ ایسے فرائض بھی عائد کئے جائیں جن سے تربیت ذہنی ہو سکے۔ پس جو ذہین اور بافہم ہوں گے، انتظام وانصرام کے اہل ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں ریاست میں داخلی وخارجی فتنوں کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ جس کی روک تھام کے لئے فوجی تنظیم بھی ضروری ہے۔ اس کے لئے ہر غلام کو فنون جنگ کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے۔

اب واضح ہو گیا کہ غلاموں پر تین قسم کے فرائض عائد کرنا ضروری ہے۔

① سب سے پہلا فریضہ ریاست واملاک کا وہ کام جو اس غلام کے سپرد کیا جائے مثلاً کاشتکاری، باغبانی، محرری، پیمائش، آبپاشی، نظامت تحصیلداری، ضلعداری وغیرہ وغیرہ۔

② دوسرا فریضہ حصولِ تعلیم بغرض تربیتِ قوائے ذہنی۔

③ تیسرا فریضہ حصولِ تعلیم، فنونِ جنگ وورزش وغیرہ بغرض تربیتِ قوائے جسمانی۔

اب چونکہ سب سے زیادہ ضروری تو کاروبارِ املاک ہے لہٰذا باقی ہر دو فرائض کے لئے تقسیمِ اوقات کی ضرورت ہو گی۔ سب سے بہتر اوقات یہ ہوں گے۔

ا : قبلِ طلوعِ آفتاب گھنٹہ آدھ گھنٹہ تمام غلام اپنے اپنے حلقہ میں زبانی تعلیم حاصل کریں۔

ب : بعدِ طلوع اپنے اپنے فرائض منصبی میں مصروف ہو جائیں۔

ج : دوپہر کو کھانا کھانے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر تقریباً نصف گھنٹہ کے لئے اپنے اپنے حلقہ میں جمع ہو کر فنی تربیت حاصل کریں اور بعدِ فراغ کاروبار املاک میں مصروف ہو جائیں۔

د : شام کو پھر اپنے مرکز پر پہنچ کر فنونِ جنگ کی تربیت حاصل کریں۔

ہ : شب کو کچھ وقت کے لئے تحصیلِ علوم وتربیتِ قوائے ذہنی کے لئے جمع ہوں۔ اس کے بعد اپنے اپنے منصب پر پہنچ جائیں اور رات کا کچھ حصہ مطالعہ کتب پر صرف کریں۔

شب کے وقت تو ہر غلام تربیتِ ذہنی کے لئے وقت نکال سکتا ہے۔ کتب بینی کرسکتا ہے۔ جو تعلیم ابتدائے شب میں حاصل کی تھی اسی پر غور وخوض کر کے ذہن نشین کرسکتا ہے۔ جن غلاموں کو اعلیٰ خدمات کے حصول کا شوق ہوگا وہ تو حصولِ تعلیم وتربیتِ قوائے ذہنی میں ضرور منہمک رہیں اور اپنے فرائضِ منصبی بھی تن دہی سے انجام دیں گے تا کہ کسی وقت مالک کی نظر ان پر پڑ جائے تو کوئی منصبِ اعلیٰ ان کو تفویض کر دے۔

مگر کیا کوئی غلام جو تربیتِ قوائے ذہنی یا ورزشِ جسمانی ہی کو فریضہ حقیقی سمجھ کر کاروبارِ املاک سے غافل ہوجائے یا ترک ہی کر دے۔ مالک کو خوش کرسکتا ہے؟ کیا ایسی حالت میں کہ جب کھلیان میں آگ لگ گئی ہو اور غلاموں کی ورزش کا وقت ہو مالک اس سے خوش ہوسکتا ہے کہ کسی غلام نے ورزش کرنا نہ چھوڑا اور کھلیان جل کر خاکستر ہوگیا۔ یا ایک غلام جو فصل کی رکھوالی پر متعین ہو، تمام شب کتب بینی میں مصروف رہے اور کھیتی کو جنگلی جانور برباد کردیں۔ کیا صرف یہ کہہ کر مالک کے غضب سے بچ سکتا ہے کہ۔

''میں تو حضور کے حکم کے مطابق مطالعہ کتب میں مصروف تھا''۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ ایک غلام جو کبوتر خانہ کے قریب وقتِ مقررہ پر ورزش کر رہا ہو اور کبوتر خانہ میں خود مالک ہی کی بلی داخل ہوجائے تو کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ کبوتروں کو بلی سے بچانے کی کوشش کرے۔ اگرچہ ان کی حفاظت ونگرانی اس کے فریضہ منصبی میں داخل نہ ہو۔ اگر بلی کبوتروں کو مار ڈالے تو کیا اس غلام کا یہ بیان اس کو مالک کے غضب سے بچا سکتا ہے کہ:۔

''میں تو حضور کے حکم کے مطابق ورزش جسمانی میں مصروف تھا جس کے

لئے حضور ہی نے وقت مقرر فرمایا ہے"۔صاحبان عقل غور کریں۔

قربان اس مالکِ حقیقی کے جس نے اپنے بندوں پر ایسے فرائض عائد کر دیئے ہیں جن سے ان کے قوائے ظاہری و باطنی کی نشوونما ہوتی رہے تا کہ اس کی حقیقی بندگی کے اہل بن سکیں جو بغیر تزکیہ نفس و صفائے باطن ممکن نہیں۔

اب پھر اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔پیشتر بیان ہو چکا ہے کہ ریاستِ مذکورہ میں اِس کی بھی ضرورت ہوگی کہ ہر موضع میں غلاموں کی ضروریاتِ زندگی، آلاتِ کاشت، خوراک ولباس وغیرہ کے ذخائر قائم کئے جائیں۔جن کو انگریزی زبان میں اسٹور (Store) کہتے ہیں اور ہر ذخیرہ پر ایک مہتمم یا اسٹور کیپر مقرر کیا جائے تا کہ حسبِ ضرورت اپنے حلقہ کے غلاموں کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

ہر حکومت اپنے ملک میں فوجی مراکز پر سامان واسباب کے ذخائر قائم کرتی ہے۔ ہر ذخیرہ پر ایک مہتمم یا اسٹور کیپر ہوتا ہے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ اگر کوئی اسٹور کیپر سرکار کے مال کو اپنا سمجھ کر اپنے مصارفِ ذاتی پر خرچ کرنے لگے تو گو چند سال اپنی عیاری سے مامون رہے مگر بالآخر بوقت محاسبہ پکڑا جائے گا اور سزایاب ہوگا۔

اسی طرح نقد رقوم کے لئے سرکاری خزانے ہوتے ہیں۔ ہر خزانے پر ایک خازن یا مہتمِم خزانہ معین ہوتا ہے تا کہ وہ حسبِ ضرورت کارِ سرکار رقوم صرف کرنے کے لئے دیتا رہے۔اگر کوئی خازن یا مہتمم اپنی تنخواہ سے زائد رقم نکال لیا کرے اور خزانے کو اپنے ذاتی مصارف پر صرف کرے تو بوقتِ محاسبہ اس پر غبن کا مقدمہ قائم ہوگا اور بالآخر سزایاب ہوگا۔

قربان اس شہنشاہ حقیقی کے جس نے اپنی سلطنت میں اپنے بہت سے بندوں کو خازن مقرر فرمایا ہے اور اپنے خزانے ان کے سپرد کئے ہیں۔مگر افسوس کہ دنیا میں اکثر خزانچی دیانت سے کام نہیں کرتے

بلکہ اُس خزانے کو اپنی ملکیت سمجھ کر مصارفِ ذاتی پر صرف کرتے ہیں۔ حالانکہ مالکِ حقیقی نے اپنے محبوب کی زبانی ہم تک پیغام پہنچادیا ہے اور بتلا دیا ہے:۔

الاغنیآء خزنۃ اللہ و الفقرآء عیالہ (مالدار اللہ تعالیٰ کے خزانچی ہیں اور اہل حاجت اس کے بال بچے ہیں)۔

اب اہلِ دولت ہوشیار ہوجائیں اور سوچ سمجھ لیں، وقتِ محاسبہ قریب ہے۔ حساب دینے کے لئے تیار ہوجائیں۔ اللہ کے بندو! ذرا غور کرو۔ آقا تو فرماتا ہے:۔

لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴿۱۱۶﴾ البقرۃ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب کچھ اس کا ہے۔

ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام مال ودولت، اسباب وجائداد وغیرہ سب ہماری مِلک ہیں۔ ہم ہی بلاشرکتِ غیر اس کے مالکِ مستقل ہیں۔ یہ ہمارے عیش وعشرت کے لئے ہے۔ مسلمانو! سوچو اور غور کرو۔ معلوم نہیں کس وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑے اور اس اسٹور کا چارج دوسرے اسٹور کیپروں کے حوالہ کرنا پڑے۔

میں اصل مقصد سے کچھ دُور ہوگیا۔ عرض کرنا یہ مقصود تھا کہ اس ریاست کے نظام میں جس کی مثال ناظرین کے زیرِ نظر ہے۔ ہر غلام کو ترقیِ قوائے ذہنی وجسمانی کی فکر ہوگی اور ہر ایک یہی کوشش کرے گا کہ کوئی اعلیٰ خدمت حاصل کرسکے لہٰذا جن غلاموں میں اہلیت پیدا ہوتی جائے گی، اعلیٰ مناصب پر متعین ہوتے رہیں گے۔ پھر ان اعلیٰ عہدیداروں میں سے بعض اور ترقی کریں گے۔ یہاں تک کہ ان ہی میں سے ایک شخص مختارِ عام کی منزلت پر پہنچ جائے گا۔

ممکن ہے کہ کوئی یہ خیال کرلے کہ اک غلام کی ترقی کی حد یہ ہے کہ وہ ریاست کا مختارِ عام ہوجائے۔ مگر نہیں۔ اس کی منزلِ کمال تو یہ ہے کہ وہ مالک کو اپنالے اور ایسی خدمات کرے کہ اس کے مزاج میں دخیل ہوجائے تاکہ مالک تمام کام اس پر چھوڑ دے اور وہ مالک کی مشیت وارادے کا محل بن جائے جو شخص مزاج دان نہ بن سکے گا۔ اس عہدہ جلیلہ پر قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہ ایک صاحبِ فہم وذکاء

تو مالک کی مرضی بغیر بتلائے ہی سمجھ سکتا ہے اور وہی مالک کی نیابت کا اہل ہوسکتا ہے۔مگر کم فہم غلاموں کو ہر کام کے لئے مفصل ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسے اشخاص مالک کی نیابت کر ہی نہیں سکتے۔

بعض اشخاص تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کو جزئیات کے لئے مفصل ہدایات نہ کی جائیں تو تمام کام خراب و برباد ہو جائے۔اس کی ایک مثال ہدیۂ ناظرین ہے۔

مثال

ایک شخص سفر کو جاتے ہوئے ملازم سے کہہ گیا کہ مکان کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔واپس آیا تو دیکھا کہ ان بیش قیمت قالینوں کو جو کمرے میں بچھے ہوئے تھے دیمک لگ گئی ہے۔ملازم سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا کہ ''حضور نے مکان کی دیکھ بھال کا حکم دیا تھا۔فرش کے لئے تو کچھ فرمایا ہی نہیں تھا۔''

ایک مثال اور بھی ملاحظہ فرمالیں۔ایک نواب صاحب نے ایک غلام خریدا۔بائع نے آگاہ کر دیا کہ اس غلام میں ایک سخت عیب ہے جس کی وجہ سے اس کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بغیر کہے کوئی کام نہیں کرتا۔نواب صاحب نے کہا یہ تو کوئی عیب نہیں۔غلام کو گھر لے آئے۔ہر حکم کی فوری تعمیل کرتا تھا۔بہت خوش ہوئے۔کہنے لگے،اِس کو خواہ مخواہ ہی عیب لگاتے تھے۔

نواب صاحب کے پاس ایک نہایت بیش قیمت مُرصّع مصلیٰ تھا۔جس کو صرف عیدین میں استعمال کرتے تھے۔عید آئی تو غلام کو حکم دیا کہ یہ مصلیٰ عیدگاہ لے جاؤ اور امام کے پیچھے پہلی صف میں بچھا کر اس کے قریب بیٹھ جاؤ۔جب تک ہم نہ آئیں،اس کی حفاظت کرو۔نواب صاحب نماز میں شریک ہوئے۔واپس آ گئے۔دوسرے روز مصلیٰ یاد آیا۔غلام سے دریافت کیا کہ تم عیدگاہ سے مصلیٰ لے آئے تھے؟ غلام نے عرض کی۔''حضور نے لانے کا حکم تو دیا ہی نہ تھا''۔

ناظرین غور کریں۔کیا ذی فہم اشخاص ایسا کر سکتے ہیں؟ سمجھدار غلاموں سے ایسا کام ہوسکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔وہ تو مالک کی مرضی کو اپنے فہم و ذکا سے سمجھ لیتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ مالک کی املاک میں کس طرح تصرف کیا جائے جو اس کی مرضی کے مطابق ہو۔اس کی تائید میں ایک چشم دید

واقعہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ایک رئیس صاحب کو اپنا ایک ملازم تمام عزیز و اقارب سے زیادہ محبوب تھا ایک روز چند اعزہ نے اس کی بدسلوکیوں کی شکایت کی۔ رئیس صاحب سُن کر خاموش رہے اور اس سے کوئی باز پرس نہ کی۔ اس پر سب کہنے لگے کہ آپ کی حد درجہ نرمی نے اس کو ایسا گستاخ بنا دیا ہے کہ آپ کے اعزہ سے بھی بدسلوکی کرتا رہتا ہے۔ اگر اس کی فہماش کرتے تو یہ نوبت نہ آتی۔

رئیس صاحب نے جواب دیا کہ یہ ملازم مجھ کو بے حد عزیز ہے۔ اگر آپ لوگ اس کا سبب دریافت کرنا چاہتے ہیں تو آپ میں سے ایک شخص چند روز میرے پاس قیام کرے۔ حقیقت اس پر آشکار ہو جائے گی۔

چنانچہ انہیں میں سے ایک صاحب نے رئیس صاحب کے پاس قیام کیا۔ تو دیکھا جب کھانے کا وقت ہوا اور دستر خوان بچھایا گیا تو رئیس صاحب نے فرمایا۔ آج فلاں ترکاری ہوتی تو کیا ہی خوب ہوتا۔ جب کھانا چُنا گیا تو وہی ترکاری دستر خوان پر موجود تھی۔

اسی طرح وہ عزیز صاحب دورانِ قیام مشاہدہ کرتے رہے کہ رئیسِ مذکورہ کو جس چیز کی خواہش ہوتی وہ ملازم بغیر اس کے کہ آقا نے پہلے اس کا اظہار کیا ہو وہی شے کھانے کے وقت پیش کر دیتا تھا۔

پس ایک روز رئیس صاحب نے عزیزِ مذکور سے فرمایا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ ملازم مجھے کیوں اس قدر عزیز ہے کہ میں اس سے کسی بات کی باز پرس نہیں کرتا۔

ناظرین غور فرمائیں کہ یہ کیا بات تھی۔ کیا اُس ملازم کے پاس کوئی سفلی یا علوی عمل تھا؟ کیا وہ جادوگر تھا۔ نہیں ایسا تو ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہ تربیتِ قوائے ذہنی کا اثر تھا کہ آقا کے دل میں جو خواہش پیدا ہوتی تھی۔ ملازم کا ذہن اس کا اثر قبول کر لیتا تھا۔ اس کو مزاج دانی کہتے ہیں۔ جس شخص کے قوائے ذہنی کی پوری پوری تربیت ہو جاتی ہے اس میں یہ اہلیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک دوسرے شخص کے پاس رہ کر اس کی مرضی کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔

اب ناظرین کو اصل مقصد کی طرف پھر توجہ دلاتا ہوں کہ تمثیلِ پیشِ نظر میں ریاست کے تمام غلاموں میں سے جو شخص جملہ اُمورِ انتظامی میں مہارت تامہ حاصل کر چکا ہو اور مالک کا مزاج داں بھی ہو جائے۔ یہاں تک کہ مالک کے منشاء کو بغیر بتائے ہی سمجھ سکے۔ تو کیا ایسا بندہ اپنے آقا کی تمام املاک پر اختیارِ کلی حاصل نہ کر لے گا۔ ضروری ہے کہ ایسے غلام کو آقا اپنی تمام املاک میں تصرفِ کامل کے اختیارات عطا کر دے اور تمام غلاموں پر آقا کے بجائے اس کی طرف سے حکم کرنے والا یہی بندہ ہو جائے۔

اب غور کریں کہ بندگی کا کمال کیا ہے۔ کمالِ عبدیت یہ ہے کہ عبد اپنے معبود میں فنا ہو جائے یعنی بندہ کی ہر خواہش آقا کی منشاء کے مطابق ہو۔ اِس طرح عبد کی رضا معبود کی مرضی اور معبود کی رضا عبد کی مرضی ہو جائے۔ اِس مقام پر پہنچ کر بندہ کو مالک کی املاک میں حقِ تصرف حاصل ہو جائے گا اور چونکہ یہ تصرف مالک کی مرضی سے اس کی نیابت میں ہوگا لہٰذا متصرفِ حقیقی خود مالک ہی ہوگا نہ کہ مملوک۔ وہ تو صرف ایک آلہ کار ہے۔

یہاں تک تو معبودانِ مجازی کی عبادت کا ذکر ہے۔ اب غور کریں کہ معبودِ حقیقی کی عبادت کے منازل کیا ہیں۔ جن بندوں کو اُس نے خود اپنے ''عبد'' کا خطاب عطا فرمایا۔ ان کے مراتب کیا ہوں گے۔ ان کی بندگی کس قدر عظیم ہوگی۔

ہمارے لئے تو اُن بندوں کی عبادت ہی کا سمجھنا مشکل ہے جو بتدریج عبدیت میں ترقی کرتے کرتے منزلِ فنا پر فائز ہو جائیں پھر اُن بندوں کی عبادت کے متعلق ہم کیا تصور کر سکتے ہیں جو پیدا ہی ''عبدِ کامل'' ہوئے ہوں۔ وہ ہی تو خلیفۃ اللہ، اس کے اصلی نائب ہوں گے۔ وہی بندے صفاتِ الٰہیہ کے مظہرِ کامل ہوں گے۔ تب ہی تو وہ یہ تعلیم دینے کے لئے منتخب کئے جائیں گے کہ:

> ''اے دنیا والو! اے انسان نما حیوانو! تم ربّ کے بندے بن جاؤ تاکہ تم فرشتوں سے افضل ہو جاؤ اور تم میں آقا کے صفات نظر آنے لگیں''۔

چنانچہ ایک عبدِ کامل دنیا میں رَب کا پیغام پہنچانے آیا۔ اس نے سب کو سنایا ''ایہا الناس تخلقوا باخلاق اللہ'' (لوگو! تم اپنے میں صفاتِ الٰہیہ پیدا کرو)۔

دنیا کا یہی قاعدہ ہے کہ ہر دار العلوم میں کسی علم یا فن کا معلم وہی مقرر کیا جاتا ہے جس کو اس علم یا فن میں مہارت تامہ حاصل ہو۔ اب غور کریں کہ جو بندہ حصولِ صفاتِ الٰہیہ کے طریقے سکھانے کے لئے منتخب کیا گیا ہو، وہ خود کیا صفاتِ الٰہیہ کا حامل نہ ہوگا؟ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ ہم تو وہم وگمان ہی نہیں کر سکتے کہ ایسا بندہ ان صفات میں کس قدر بلند منزلِ کمال پر فائز ہوگا۔ خدا کے اس بندے کی منزلت سمجھنا ہماری عقل وفہم کی رسائی سے بالاتر ہے۔ خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں۔ انسان کا کیا ذکر فرشتے بھی یہی کہیں گے ۔

اگر ایک سرموئے برتر پرم!
فروغ تجلی بسوزو پرم!

اللھم صلی علیٰ عبدك وحبیبك محمدن المصطفی سید الانبیاء و المرسلین و اله الطاھرین کافضل ماصلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ آل ابراھیم انك حمید مجید (آمین)

عبدیّت !

عبادت کی تشریح کے بعد اس کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ’’عبدیت‘‘ کی بھی کچھ وضاحت ہو جائے۔ اتنا تو ہر فرد جانتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی بندگی کرنی چاہے تو ضروری ہے کہ پہلے اس کا غلام تو بنے، ورنہ کسی شخص کے لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ بغیر ملازمت اختیار کئے کسی حکومت کی خدمت انجام دے سکے اور غلام اس وقت بن سکتا ہے جب غلامی حاصل کرنے کے لئے اس حکومت کے سوائے سب کو چھوڑ دے۔ کسی دوسری حکومت یا کسی دوسرے حاکم کی حکم برداری نہ کرے بلکہ سب سے منہ موڑ کر صرف حکومت کا ہو جانے کا ارادہ کر کے دفترِ حکومت میں پہنچے۔ عہد نامہ پُر کرے تب کہیں حکومت کی غلامی میں داخل ہو سکتا ہے۔

ہر ملک میں کروڑوں افراد ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں۔ جن کے ذرائع آمدنی ان کی کفالت کے لئے کافی و وافی ہوتے ہیں۔ کسی کو تلاشِ ملازمت کا خیال ہی نہیں آ سکتا۔ جس کو اپنی احتیاج کا احساس ہوگا۔ اُسی کو ملازمت کی تلاش ہوگی اور ایسا شخص ہی حصولِ ملازمت کے لئے درخواست کرے گا۔ اگر درخواست منظور ہو جائے تو عہد نامہ پُر کر کے ہی ملازمت حاصل ہوتی ہے۔

ہم کو چاہئے کہ اپنے نفسوں سے خطاب کریں اور توجہ دلائیں کہ غور تو کرو۔ جب ایک مادی حکومت کا خادم یا غلام بننے کے لئے گھر بار، بیوی، بچے، عزیز و اقارب، دوست، احباب، کھیل، تماشے سب کچھ چھوڑ کر سب سے منہ موڑ کر حکومت کے دفتر میں جاتے ہیں اور کتنے ہی چکر لگاتے ہیں، تب کہیں حکومت کی غلامی میں نام لکھا جاتا ہے۔ تو پھر سب سے بڑی حکومتِ نُورانیہ کی غلامی بغیر کسی قربانی کے کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

اے نفس امارہ پہلے بندگیٔ شہوات و ہویٰ سے تو نکل۔ دیکھ مولائے جلیل فرماتا ہے:۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ فرقان

اے حبیبؐ۔ کیا تم نے اُسے دیکھا جس نے جذبات ہی کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ پھر تم اُس کے امور کی درستی کرنے والے کیسے ہو سکتے ہو۔

پس جب تک ہم ہویٰ وہوس کی بندگی سے نہ نکلیں گے ہماری نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ، قربانی، اورادووظائف اگر ''میرے مذہب'' کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنے رہیں اور صرف رواسم کی پیروی تک محدود ہوں، نفس پرستی ہی میں شامل رہیں گے اور ہم شرکِ باطنی میں مبتلا رہیں گے۔ غفلت و لاشعوری بڑھتی جائے گی، جس کا نتیجہ خسران ہی ہوگا۔ اور ہم رحمتِ ایزدی اور عالمِ نُور تک پہنچ نہ سکیں گے۔

اتنا تو ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ غلام کو اپنے آقا کا حکم سب سے زیادہ محبوب ہونا چاہئے کہ وہ اُسی کی اطاعت کرے۔ مالک کے سوائے کسی غیر کو اس سے زیادہ یا اس کی مثل محبوب نہ رکھے۔ اب جس حاکمِ اعلیٰ واجل کی بندگی کا ہم دعویٰ کرتے ہیں اور فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہوئے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اس کے بندے ہیں۔

اس کا فرمان دیکھ لیں۔ وہ تو ارشاد فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ توبہ

کہہ دو۔ اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ قبیلہ، اور وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جو تم کو پسند ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد (کوشش) کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ عذاب لائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

یہ ہیں بندگی کے شرائط جو عقل وفطرت کے عین مطابق ہیں۔ مالک اُسی کو ہدایت کرتا ہے یعنی اُسی کو اپنا بندہ بناتا ہے جو بندگی کے یہ شرائط پورے کرے اور ان سب چیزوں کو مالک کے حکم سے زیادہ عزیز نہ رکھے، تب ہی اس کی بندگی میں نام لکھا جا سکے گا۔

پہلے اس پر تو غور کریں کہ کسی کی بندگی یا ملازمت وہی شخص اختیار کرتا ہے، جس کو اس کی خواہش ہو اور خواہش اُسی وقت ہوتی ہے جب نفس کو ضرورت کا احساس ہو۔ ضرورت کے احساس ہی سے کسی غنی کی جستجو ہوتی ہے تا کہ اس کی طرف متوجہ ہو۔

پس جس ذات کے غنی ہونے کا نفس کو شعور ہو گا، اُسی کی طرف توجہ کرے گا۔ پھر جب ہم کو ضرورت کا احساس ہی نہیں تو حصولِ عبدیت کی خواہش ہی کیوں پیدا ہو اور بغیر خواہش کے غنی المغنی کی طرف توجہ ہی کیوں ہو۔ اگر کسی وقت عجز و احتیاج کا احساس ہو بھی گیا تو اس وقت بھی اُسی ذات کی طرف توجہ ہو گی جس کے غنی ہونے کا نفس کو پہلے سے احساس ہو۔ معبودِ حقیقی کے وجود اور اس کے غنی ہونے کا تو نفس کو احساس ہی نہیں اس لئے کہ غیب کا احساس تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا تو ادراک ہو سکتا ہے وہ بھی طلب و کوشش کے بعد۔ لہٰذا جس ذات کا احساس و شعور نہیں اس کی طرف توجہ کرنا کیسے ممکن ہے۔

پہلے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ نفس کو اس کا احساس ہو جائے کہ میں فانی ہوں کسی طرح بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ تب ہی تو اِس کو طلب ہو گی کہ کسی غیر فانی ذاتِ باقی کو تلاش کروں جو میری بقا کا ذریعہ ہو جائے اور جب تک اس ذات کی بقاء دائمی کا یقین نہ ہو گا اس کی طرف نفس کی توجہ نہ ہو گی۔

اسی طرح نفس کو پہلے اس کا احساس ہو جائے کہ میں نہایت ذلیل، نافہم، جاہل، نادان، عاجز و ضعیف چھوٹا سا مجسمہ ہوں۔ اُس وقت ہی تو اِس کو ایسی ہستی کی تلاش ہو گی جو اس کے نقائص کو کمالات سے بدل دے اور اُس ہستی کی طرف اِس کو اُسی وقت توجہ ہو سکتی ہے جب اُس کی کبریائی، عظمت، حکمت و قدرت، ہمیشہ باقی رہنے، ہر شے پر قادر ہونے کا بھی یقین ہو گیا ہو۔

جب نفس کو اس کا شعور ہو جائے کہ میں حیاتِ حقیقی سے محروم ایک میت ہوں اور حصولِ حیاتِ حقیقی کی کوشش کرنا ضروری ہے، اُس وقت ہی حی و قیوم کی طرف متوجہ ہو گا۔ جب تک ہوئٰ و ہوس، خواہشات و جذبات پر غلبہ حاصل نہ ہو اور نفس کشی نہ کرے جس کے لئے مولائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:۔

موتوا قبل ان تموتوا (مرجاؤ قبل اس کے کہ تم مرو)۔

اُس وقت تک اِس کو یہ احساس ہو ہی نہیں سکتا کہ میں حیاتِ حقیقی سے محروم ایک میت ہوں۔

اِسی طرح جب نفس کو یہ احساس ہوگا کہ اِس دنیا میں کوئی شے میری نہیں، اُسی وقت تو اُن کے مالکِ حقیقی کی طرف توجہ کرے گا اور یہ خواہش پیدا ہوگی کہ کسی طرح مالک تک پہنچ جاؤں اور میں اُس کا ہو جاؤں تو یہ سب کچھ میرا ہو جائے۔

غرضیکہ جب تک نفس کو اپنے ناقص ہونے کا احساس نہ ہوگا، کامل کی تلاش ہی کیوں کرے گا اور کامل کے کمال کا جب تک شعور نہ ہوگا اس کی طرف راغب ہونا ممکن نہیں۔ جب ذاتِ کامل کی عظمت و کمال کا یقین ہو جائے گا تو پھر لازمی امر ہے کہ اُس بارگاہِ عظمت و جلال کی غلامی کے حصول کی خواہش پیدا ہو جائے۔ جب اُس کی بندگی طلب کرے گا اور اُس کی غلامی مل جائے گی اور اُس حکومت کا سپاہی بن جائے گا تو حکومت کی عزت، حکمت، قدرت، جلال و عظمت، شان و شوکت میں تھوڑا بہت حصہ اِس کو بھی عطا ہو جائے گا۔

اِس لئے کہ جس وقت بھی کوئی شخص کسی حکومت کی غلامی میں داخل ہوتا ہے مثلاً پولیس کا کانسٹیبل یا چپراسی ہی ہو جاتا ہے۔ اُسی وقت حکومت کی شان و شوکت، عزت و قوت کا تھوڑا بہت جُز خواہ کتنا ہی قلیل ہو اُس کو مل جاتا ہے کہ وہ عوام سے ممتاز ہو جاتا ہے اور امورِ حکومت میں تھوڑا بہت دخیل ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو حکومت کی نیابت ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ہر حکومت کی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمت یا غلامی کے لئے کچھ نہ کچھ استعداد یا قابلیت ضروری ہوتی ہے مثلاً دفاتر کی ملازمت کے لئے حکومت کے مقررہ و منظور کردہ امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ پولیس اور فوج کے سپاہی کے لئے جسمانی اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میڈیکل اگزامینیشن، یعنی ڈاکٹری ہر ایک کی ہوتی ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ اپنے نفس سے سوال کریں کہ اے غافل، لاشعور! کیا آسمانی حکومت کی غلامی

کے لئے کوئی امتحان مقرر نہ ہوگا؟ کیا اس کے لئے کسی استعداد و قابلیت کی ضرورت نہ ہوگی؟ کیوں نہیں۔ ہے اور ضرور ہے۔ اِس کے لئے سب سے پہلی چیز اصلاحِ نفس ہے تاکہ فطرتِ صحیحہ بے حجاب ہو جائے اور ہر حرکت، ہر عمل عین مطابقِ فطرت صادر ہونے لگے۔ یہی عبادتِ حقیقی اور یہی علامتِ عبدیت ہے اسی کے لئے جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ ارشاد فرماتا ہے۔

السجدۃ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① جمعہ

جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں جو بادشاہ ہے قدوس ہے عزت وحکمت والا ہے۔

غرضیکہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے ہر شے اُس کی تسبیح میں مصروف ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ تسبیح کرنے یعنی پاکیزگی بیان کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا ہماری طرح سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتی رہتی ہے۔ نہیں بلکہ اس کی سُبحانیّت اور پاکیزگی کا اظہار کرتی رہتی ہے کہ عین مطابقِ فطرت عمل ہو رہا ہے، ہر شے قوانینِ فطرت پر عمل کرتے ہوئے اُس کی پاکیزگی کا اظہار کر رہی ہے۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی شے میں عیب نکال سکے تو پھر اُن کا خالق کیسا بے عیب ہوگا۔ اُسی کی طرف خالقِ کائنات ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ② الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ③ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ④ الملک

اور وہ غلبہ والا سب سے زیادہ بخشنے والا ہے۔ جس نے سات آسمان تہ بہ تہ خلق کئے۔ تم خدائے رحمان کی خلقت میں کوئی اختلاف نہ پاؤ گے۔ پھر نظر ڈالو کیا تم کوئی عیب دیکھتے ہو؟ پھر بار بار نظر ڈالو۔ وہ نظر تھک کر ذلیل ہو کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔ (یعنی کوئی خلل و عیب نظر نہ آسکے گا)۔

اب تو ہر شے کے تسبیح کرتے رہنے کا مفہوم واضح ہوگیا کہ خالق کی پاکیزگی اور اس کے عیبوں سے منزہ ہونے کا عملی طور پر اظہار کرنا ہی حقیقی تسبیح ہے اور یہی شانِ عبدیت ہے۔

سورہ رحمن میں بھی ارشاد فرمایا ہے:۔

وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ يَسۡجُدٰنِ⑥ رحمٰن　　بیلدار پودے اور درخت سجدہ ہی کرتے رہتے ہیں۔

اب سجدے کے معنی اور اس کا صحیح مفہوم بھی سمجھنا ضروری ہے۔ کیا زمین پر سر ٹیکنے ہی کو سجدہ کہتے ہیں؟ اگر سجدہ کے یہی معنی ہوں تو پھر تلاش کرو اور دریافت کرو کہ کسی شخص نے کبھی کیا کسی پودے یا درخت کو زمین پر ماتھا ٹیکتے دیکھا ہے۔نہیں، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ اگر سجدے کے حقیقی معنی معلوم کرنے ہوں تو قرآن ہی سے دریافت کریں۔ وہ خود ہی بتلائے گا کہ ''سجدہ'' سے کیا مراد ہے اور درخت اور پودے کس طرح سجدۂ خالق میں مصروف رہتے ہیں۔ دیکھئے جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ اپنے کلامِ پاک میں ارشاد فرماتا ہے:۔

نوٹ: یہ آیہ سجدہ ہے۔ آواز سے پڑھنے پر سجدہ کرنا لازم آتا ہے۔ دل ہی دل میں بغیر آواز کے پڑھ سکتے ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيۡرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ الۡعَذَابُ ؕ وَمَنۡ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّكۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ⑱ الحج

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کو سجدہ کررہے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت چوپائے اور بہت سے لوگوں میں سے بھی۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب لازم ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہوسکتا اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

دیکھیے ہر شخص جانتا ہے کہ سجدہ افضل ترین عبادات ہے۔ لائقِ غور امر یہ ہے کہ سجدے کے معنی کیا ہیں۔ اور سجدہ کس کو کہتے ہیں۔

اس آیہ وافی ہدایہ میں سجدے کے معنی واضح کردیئے ہیں۔ اگر غور کریں تو سجدے کا مفہوم بالکل واضح ہوجائے۔ یہاں انسان کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اے بے بصیرت دیکھ، تمام مخلوق جو آسمانوں اور

زمینوں میں ہے سجدۂ خالق میں مصروف ہے۔ پس معلوم ہوا کہ فطرت کے مطابق عمل کرنا۔ اس سے سرمو تجاوز نہ کرنا ہی افضل ترین عبادت ہے اور یہی سجدۂ حقیقی ہے۔

دیکھیے قرآنِ پاک کس طرح کھول کھول کر بیان کر رہا ہے کہ اے غافل انسان! دیکھ تمام مخلوق سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور کچھ لوگ عین مطابقِ فطرت عمل کر رہے ہیں اور قوانینِ فطرت سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ صرف تُو ہی ایسا بد بخت ہے کہ تیرے ہم جنس اپنی فطرت کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ خالقِ کائنات نے تو بتلا دیا ہے کہ اصل دین اور حقیقی اسلام یہی ہے کہ بندہ اپنی اُس فطرت کے مطابق عمل کرے جو خالق نے اس کے اندر ڈالی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ روم

پس اپنے نفس کو قائم کر لے دین کیلئے یکسو ہو کر۔ اللہ کی وہ فطرت جس پر لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی تو مضبوط دین ہے۔ لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

خالق نے تو بتلا دیا تھا کہ وہ فطرت جو تیرے اندر القا کی ہوئی ہے اس کے عین مطابق عمل کرنا ہی اصل اسلام اور حقیقی دین ہے۔ کیا ہر بچہ یہ فطرت لے کر پیدا نہیں ہوتا کہ میں ''سب سے اچھا'' پس اُس کو لازم تھا کہ سب سے اچھا بننے اور بنا رہنے کی کوشش کرتا رہے۔ یہ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

مگر چونکہ اچھا بننے کی کوشش سے نفسِ امارہ کو اذیت ہوتی ہے۔ لٰہذا وہ اِس سبق کو بھلا دینے کی کوشش کرتا ہے اور اِس کے بجائے یہ خواہش ہو جاتی ہے کہ میں اچھا سمجھا جاؤں۔ مجھے کوئی برا نہ کہے۔ مگر اِس کو بُھلائے رہنے کے باوجود جب کوئی اُس کو بُرا کہتا ہے تو وہ بُھولا ہوا سبق یاد آ جاتا ہے اور بُرا کہنے والے سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ فطرت اُبھر آتی ہے کہ ''میں اچھا'' اور یہ کبھی نہیں بدلتی۔

کائنات کی ہر شے کو دیکھ جایئے کہ اپنی فطرت پر عمل کرتے ہوئے ہر ایک کو دعوت دیتی رہتی ہے کہ دیکھو کیا تم میرے اندر کوئی عیب نکال سکتے ہو۔ پس جب میرے اندر کوئی عیب و نقص نہیں تو میرا

خالق کیسا پاک و پاکیزہ اور ہر عیب سے منزّہ ہوگا۔ کائنات کی تمام مخلوق میں صرف ایک انسان ہی ایسا بد بخت ہے کہ اُس کے اکثر ہم جنس خالق کی پاکیزگی کا اظہار نہیں کرتے اور اپنی فطرت کے خلاف بداعمالیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

اے غافل انسان! کائنات کی ہر شے پر نظر ڈال کر دیکھ کہ وہ کس طرح ہر دم و ہر لحظہ اپنے خالق کی تسبیح کرنے، اس کے منزّہ اور بے عیب ہونے کا اپنے عمل سے اظہار کرتی رہتی ہے۔

آفتاب کو دیکھ کہ وہ اپنی شعاعیں پھیلاتا ہے۔ تمام مخلوق کو نُور بخشتا ہے۔ اس کا فیض چرند و پرند، انسان و حیوان، شجر و حجر، بینا و نابینا سب کے لئے یکساں ہے وہ تو روشنی دے رہا ہے جو چاہے فائدہ اٹھائے۔ جس میں اہلیت ہو فیض حاصل کرے۔ اُسے تو کسی سے کوئی غرض نہیں۔ اُس کی اپنی کوئی خواہش نہیں۔ وہ کسی سے کچھ نہیں چاہتا۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

چاند کو دیکھیں کہ دریا، پہاڑ، صحرا، آبادی، بیابان، نخلستان، ریگستان، حیوان و انسان سب کو یکساں روشنی دیتا ہے۔ اپنی معینہ گردش سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتا۔ نہ کسی سے دوستی نہ دشمنی۔ نہ کسی سے کوئی خواہش نہ غرض۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

ستارے، سیارے، تمام اجرام فلکی اپنے معینہ محور پر گردش کر رہے ہیں۔ اپنے مقررہ راستے پر شب و روز سرگرمِ سفر ہیں۔ رات کو چمک کر تاریکی کو کم کرتے ہیں۔ اندھرے میں سمندروں اور بیابانوں میں راہ دکھاتے ہیں۔ تمام مخلوق کو یکساں فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ اُن کی اپنی کوئی غرض نہیں۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

پہاڑوں کو دیکھو زمین کے سینہ کو مضبوطی سے دبائے فضا میں سربلند کئے کھڑے ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے لئے ہر دم کمر بستہ رہتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ ہوائیں پانی لئے ہوئے گزر جائیں۔ فوراً روکیں گے اور اپنے دامن میں بسنے والے جنگلات کو بارش سے مالا مال کردیں گے۔ زمانۂ سرما میں دھیان رہتا ہے کہ گرمی کا موسم آرہا ہے۔ زمین اور اس پر بسنے والے پیاسے ہوں گے، اُن کو سیراب کرنا

ضروری ہے۔ لہٰذا اپنی چوٹیوں پر منجمد پانی کے خزانے جمع کر لیتے ہیں اور بہم رسانی آب کے لئے کروڑوں ٹن برف کے تودے اپنے سروں پر اٹھائے وقت کے منتظر رہتے ہیں اِس طرح بہم رسانی آب کا بندوبست کرتے ہیں کہ شب وروز مخلوقِ خدا کو پانی پہنچاتے رہیں۔ موسمِ گرما شروع ہوا اور برف کے تودے پگھل پگھل کر پیاسی زمین کو سیراب کرنے لگے۔ پانی چوٹیوں پر سے اُترا اور پہاڑ اپنی ہر ایک گھاٹی اور وادی میں اس کو تقسیم کرنے لگے۔ اُن کو اپنی کوئی غرض نہیں۔ کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

درختوں کو دیکھو کس طرح سجدۂ خالق میں مصروف ہیں۔ ہر درخت مخلوقِ خدا کے لئے سایہ بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے سایہ میں جو بھی چاہے بیٹھے۔ اس سے فائدہ اٹھائے۔ دیکھو وہ ایسا تو نہیں کرتا کہ ایک بادشاہ یا امیر پر زیادہ خشک سایہ ڈالے اور ایک فقیر ومحتاج پر کم۔ نہیں بلکہ اس کا فیض تو شاہ وگدا، امیر وغریب، مسافر ومقیم، عالم وجاہل، برہمن وشودر، زاہد وفاسق، مومن وکافر، دوست، دشمن سب کے لئے یکساں ہے۔ وہ پھل لاتا ہے۔ رَب کے نام پر نچھاور کرتا ہے۔ صلائے عام دیتا ہے۔ خدا کے بندو! یہ مالک کا صدقہ ہے کھائے جس کا جی چاہے۔ کیا کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی کسی ایسے شخص کو جس نے اس کی شاخیں کاٹی ہوں، اپنے فیض سے محروم رکھے یا اپنے سینچنے والے کو دوسروں پر ترجیح دے۔ نہیں ہر گز نہیں، بلکہ وہ تو اپنے خالق کی پاکیزگی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ عملی طور پر دکھلاتا ہے کہ میرے رَب کی رحمت دوست ودشمن، مطیع ونافرمان، کالے گورے سب کے لئے یکساں ہے جو بھی چاہے، جس کو بھی اس کی طلب ہو فیض حاصل کرے۔ وہ تو گبر وترسا، یہودی، نصرانی، مسلم ومشرک، کافر ومومن سب کو یکساں رزق پہنچاتا ہے۔ اب بھی سمجھ میں آیا کہ درخت کس طرح اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کس طرح بارگاہِ خالقِ بے نیاز میں ہر دم سربسجود رہتے ہیں۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ اِن چیزوں میں تو اپنی فطرت کے خلاف عمل کرنے کی قدرت و اہلیت ہی نہیں۔ وہ اپنی فطرت کے خلاف عمل کر نہیں سکتے۔ تو اس شبہ کا جواب آگے آئے گا۔

پودوں کو دیکھو کس طرح تسبیح وتقدیسِ خالق میں مصروف ہیں اور ہر دم ہر لحظہ سجدۂ خالق میں سر

بسجود۔ اک گلاب کا پودا پھولتا ہے۔ خوشبو ہوا کے سپرد کرتا ہے تا کہ وہ تمام خلائق پر یکساں تقسیم کردے اور سب کے مشام کو معطر کردے۔ جس طرح وہ اپنے پرورش کرنے والے باغبان کو خوشبو پہنچاتا ہے اسی طرح اپنے پھول اور پتے توڑنے والے کے مشام کو بھی معطر کرتا ہے۔ وہ تو اپنے خالق کی فیاضی، جُودو کرم، احسان و بخشش کا نقشہ عملی طور پر اہلِ عالم کو دکھلا رہا ہے۔ اُس کے غنیٰ اور بے نیازی کا فوٹو کھینچ کر اُس کی مخلوق کے سامنے پیش کر رہا ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ اللہ کے بندو! مجھے دیکھو اور اپنے رَب کی پاکیزگی بیان کرو۔ دیکھو اور غور سے دیکھو اور ہر طرف نظر دوڑاؤ۔ کیا تم کوئی عیب میری فطرت پر لگا سکتے ہو۔ لا واللہ ہرگز نہیں۔ پس جب میں بے عیب ہوں تو میرا بلند و برتر رَب تو ہر نقص و عیب سے بدرجۂ اتم منزّہ ہوگا۔ تم اس کے کسی کام میں عیب نہیں نکال سکتے۔ یہ شانِ عبدیت ہے۔

غرض یہ کہ تمام مخلوق زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، پودے حتیٰ کہ وحوش وطیور سب کے سب تسبیح و تقدیسِ الٰہی میں مصروف اور بارگاہِ خالق میں سربسجود ہیں۔

ایک انسان ہی ایسا بد بخت ہے کہ اس کے اکثر ہم جنس فطرت کے خلاف عمل کر کے مستوجب عذاب ہوتے ہیں۔ خود اپنے پیر پر کلہاڑی مارتے ہیں۔ اپنی فطرت کا علم حاصل کرنے کے بجائے محض خواہشات وجذبات کی تسکین میں مصروف رہتے ہیں۔ چونکہ بغیر علم اپنی خواہشات وجذبات کی تسکین کرنا چاہتے ہیں، ایسے اعمال وافعال کے نتیجہ میں تباہی و بربادی خرید لیتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص نے درخت پر ایک خوش رنگ پھل دیکھا، توڑنے کی خواہش ہوئی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ پتلی شاخ پر پیر رکھ دیا۔ شاخ ٹوٹی، گرا، ہاتھ یا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ غلط خواہش اور جہالت کا نتیجہ ہوا۔ اسی طرح ہر خواہش اور جذبہ کی بغیرِ علم تسکین کرنے کا ہلاکت خیز انجام ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ اس وقت تمام دنیا فساد سے بھر گئی ہے۔ اِسی کی طرف مالک کا اشارہ ہے:۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ﴿٤١﴾ روم — خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا، اس کے سبب جو لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے کمایا۔

لوگوں نے قوم پرستی، وطن پرستی کے جذبات کی تسکین کرنی چاہی۔ اس کے نتیجہ میں تمام روئے زمین پر فساد پھیل گیا۔ اگر لوگ اپنی فطرتِ صحیحہ پر عمل کرتے ، یہ وبال کیوں آتا اور فطرتِ صحیحہ کا اُس وقت تک احساس نہیں ہوتا۔ جب تک جذبات کا جوش نہ مٹے۔ جس کے بعد ہی خودغرضی، تن پروری، نفس پرستی میں کمی ہوسکے گی اور اُسی وقت دنیا میں امن قائم ہوسکے گا۔

سطورِ بالا میں اجرامِ فلکی، آفتاب، ماہتاب، ستارگان، سیارگان، پہاڑ، پودے، درخت وغیرہ کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اُن کے متعلق معترض کہہ سکتا ہے، اُن میں خواہشات وجذبات ہیں ہی نہیں اور نہ اختیار وارادہ ہے۔ پھر اُن کی مثال سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟

بے شک یہ صحیح ہے کہ اُن میں خواہشات و جذبات نہیں۔ درست ہے اُن میں اختیار و ارادہ نہیں۔ وہ اپنی فطرت کے خلاف عمل کرنے کی طاقت وقوت ہی نہیں رکھتے۔ اِسی لئے تو اُن کے لئے کوئی فضیلت اور اجر بھی نہیں۔ مگر اُن کی تمام کیفیات سے مالک کی شانِ ربوبیت ورحمانیت کا اظہار ہوتا ہے کہ اِس عالم مادّی میں اُس کا فیض تمام مخلوق کے لئے یکساں ہے۔ جس طرح وہ مسلمین ومومنین کو نعیمِ مادی سے سرفراز فرماتا ہے۔ اِسی طرح کفار ومشرکین کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور اِس حیاتِ دنیا میں اپنے فیوض کو نافرمانوں سے نہیں روکتا۔

ایسی تمام مخلوق جن میں خواہشات وجذبات تو ہیں مگر عقل نہیں، یعنی حیواناتِ مطلق تو وہ مکلف بھی نہیں۔ ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوسکتی، صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جس کو خواہشات و جذبات کے ساتھ عقل بھی دی گئی ہے۔

پس اگر انسان کی عقلِ فطری خواہشات وجذبات پر غالب آجائے تو اس کے کام بھی بے غرض ہوجائیں۔ اُسی وقت وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہوگا اور اُسی منزل پر پہنچ کر فرشتوں سے بھی افضل ہوجائے گا۔ جب تک انسان خواہشات وجذبات کا بندہ بنا رہتا ہے۔ اُس کو کسی مخلوق پر فضیلت نہیں ہوتی۔ بلکہ تمام مخلوق سے ارزل ہی رہتا ہے جیسا کہ جناب ربّ العزت کا ارشاد ہے۔

اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؏ الفرقان ۴۴ — نہیں ہیں وہ مگر ڈھور ڈنگروں کی مثل بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

خدا کا پیارا محبوب دنیا سے خودغرضی مٹانے آیا اور محبت کا پیغام لایا۔ قرآن کریم نے ایمان کی علامت حُبّ اللہ بتلائی جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ بقرہ ۱۶۵ — جو لوگ ایمان لائے اللہ کی محبت میں بڑے شدید ہوتے ہیں۔

خدا کے حبیب نے تمام اہلِ عالم کو ایمان لانے کی دعوت دی۔ اگر ایمان لے آئیں اور حُبّ اللہ پیدا ہو جائے تو اغراض بھی مٹ جائیں۔ اس لئے کہ محبت میں احساسِ غرض نہیں رہتا۔ جن کو اللہ کی محبت مل جاتی ہے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان کے کام خلق اللہ کے فائدے کے لئے ہوتے ہیں جن میں ان کی اپنی غرض شامل نہیں ہوتی۔ یہی شانِ عبدیت ہے۔

محبت کی مثالیں بھی دیکھ لیں۔ جب انسان کسی فن میں ایسا کمال حاصل کر لیتا ہے کہ اُس فن سے محبت ہو جاتی ہے تو بے نیازی کی شان ظاہر ہونے لگتی ہے۔

ایک طبیب جو ایسی منزلِ کمال پر پہنچ جاتا ہے کہ طبابت کی محبت میں اس پر محویت و استغراق طاری ہو جاتا ہے تو اکثر راہ چلتے آدمی کو بلا لیتا ہے اور دوا دے کر کہتا ہے، یہ دوا کھا لو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اگر طبیب سے دریافت کیا جائے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو کہے گا صرف اس لئے کہ ایک بندۂ خدا ہلاکت سے بچ جائے۔ یہ شانِ عبدیت ہے۔ مگر چونکہ وہ زندگی کے صرف ایک شعبہ کے لئے فائدہ رساں ہے لہٰذا عبدیت ناقص ہے۔

ایک سائنس دان فطرت کا کوئی راز معلوم کرنے میں مصروف ہے۔ شب و روز اُسی دُھن میں غرق ہے۔ اپنے سر پیر کا ہوش نہیں۔ جب معلوم کر لیتا ہے۔ شائع کر دیتا ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے۔ ''اے انسانو! خدا کے بندو! یہ فطرت کا راز ہے اِسے سنو اور اِس سے فائدہ اٹھاؤ''۔ اِس میں اُس کی اپنی ذاتی کوئی غرض شامل نہیں ہوتی۔ یہ بھی شانِ عبدیت تو ہے مگر ناقص۔ اس لئے کہ خود اپنی

فطرت سے ناواقف ہے اور اگر اِس میں اُس کی کسی غرض کا شمول بھی ہو جائے تو بندگیٔ نفس ہو جائے گی اور شرکِ خفی ہو گا۔

اِسی طرح ہر انسان جو کسی فن میں منزلِ کمال پر فائز ہو جاتا ہے اور اِس فن سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ محویت تامّہ اور استغراقِ کامل پیدا ہو جائے تو وہ شانِ بے نیازی کا مظہر بن جاتا ہے۔

یہ تو بے نصیبی ہے کہ اُس نے اپنی فطرت پر غور نہ کیا۔ اپنے نفس کو نجاستِ لاشعوری سے پاک نہ کیا جس سے خود اُس کے نفس کو فائدہ پہنچتا اور مالک کی صفات کا مظہر بن جاتا۔ پھر اُس کی مخلوق کو بے نیازی کا مظہر بننے کے طریقے سکھلاتا اور منزلِ عبدیت میں داخل ہو کر اپنی آخرت بھی درست کر لیتا۔ مالک کے فیض و کرم کا دریا تو ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس کے کرم کی حوضیں تو ہر وقت چھلکتی ہیں۔ جو چاہے سیراب ہو۔

ہائے! انسان کیسا بدبخت ہے کہ اس کو پیاس کا احساس ہی نہیں۔ اگر احساس ہو جائے تو دوڑتا ہُوا اُس کے کرم کی چھلکتی حوضوں پر جائے اور آبِ رحمت سے سیراب ہو۔

اے غافل نادان! تیرا آقا تو ایسا غفور رحیم ہے۔ وہ تو تجھ پر ایسا مہربان ہے کہ بار بار فرماتا ہے۔ اے نادان انسان! تو گھبراتا کیوں ہے۔ کس لئے پریشان ہوتا ہے۔ میرا بندہ بننا تیرا کام نہیں۔ تیرے لئے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ تو میرا غلام بن سکے۔ یہ تو میرا ہی کام ہے۔ میں کسی کو اپنا بندہ خود ہی بناتا ہوں۔ تیری طرف سے تو صرف رغبت درکار ہے۔ اگر تو مجھ سے طلب کرے گا۔ میری بارگاہ میں درخواست پیش کرے گا۔ اور صِدقِ دل سے چاہے گا تو میں خود تجھ کو اپنا بندہ بنا لوں گا۔ کیا تجھے ہمارے وعدے کا یقین نہیں؟

وَيَهْدِيٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ رعد　　وہ اپنی طرف ہدایت کرتا ہے اس کو جو رغبت کرے۔

وہ تو ایسا کریم ہے کہ اپنی صفات دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جیسا کہ حدیثِ قُدسی میں ارشاد فرماتا ہے:۔

عبدی اطعنی اجعلك مثلی (میرے بندے میری اطاعت کرتو میں تجھے اپنے جیسا بنالوں گا)۔

یعنی تجھے ایسی صفات دے دوں گا جیسی کہ تو میرے لئے سمجھتا ہے۔ جن کو تو میری صفات خیال کرتا ہے۔

ہاں بھائیو! جناب اصدق الصادقین کے وعدے پر اگر اعتبار ہے تو ہم کو چاہئے کہ اس کی طرف رغبت کریں۔ وہ تو ہم سے صرف طلبِ صادق چاہتا ہے۔ اگر ہم کو طلب ہوگی اور اس کا بندہ بننا چاہیں گے تو صرف ہماری چاہ پر ہی وہ ہمیں توفیق عطا فرمائے گا۔ اس کی نصرت شامل حال ہوگی۔ وہ خود ہی ایسے حالات پیدا کردے گا کہ بندہ اس کی طرف کھنچا چلا جائے اور خود اس کو کوئی تکلیف کرنی نہ پڑے۔

اے نادان انسان! تو اُس کا بندہ بننے کی خواہش کر تو سہی۔ پھر دیکھ وہ تجھے اپنی طرف بلاتا ہے کہ نہیں۔ وہ تجھے اپنا بناتا ہے کہ نہیں۔ اگر تو اس کا عبد بن گیا تو فرشتے تیرے خادم بن جائیں گے اور خدائی سلطنت میں جتنی چیزیں ہیں سب تیری مطیع و فرمانبردار ہو جائیں گی۔ ہم میں سے بہت سوں نے یہ شعر سنا ہوگا ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ!

(تو اپنے پروردگار کے حکم سے گردن نہ پھرا یعنی نافرمانی نہ کرتا کہ تیرے حکم کی بھی کوئی نافرمانی نہ کرے)۔

اپنے بندگان خاص کے لئے رب نے فرمادیا ہے:۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ اللہ نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لئے ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں۔

قربان اس کی رحمت کے۔

جناب ارحم الراحمین اپنے بندگانِ خاص کے صدقے سے ہم بدنصیبوں پر بھی اپنی رحمت نازل فرمائے اور توفیقِ ہدایت عطا فرمائے تا کہ ہم بھی نفس و شیطان کی بندگی سے نکل کر اس کے بندے بن

سکیں اور اس کی عبادت بجا لاسکیں۔ آمین ثم آمین۔

اب اس مضمون کا لُبِ لباب بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تا کہ ناظرینِ رسالہ مستفید ہوسکیں اور نکات ذہن نشین ہو جائیں۔

(۱)

خدا کی عبادت کا معمولی مفہوم یہ ہے کہ جو ملک و املاک، زر و مال، اولاد وغیرہ اس نے ہمیں عطا فرمائے ہیں، سب کو اُس کی مِلک سمجھتے ہوئے اُس کی مرضی کے مطابق اِن میں تصرف کریں۔ اِن کی نگرانی و حفاظت فرض جانیں۔ مالک سے طلب کرتے رہیں کہ وہ ہمیں اِس سے محفوظ رکھے کہ اس میں ہماری اغراض و خواہشات شامل ہو جائیں۔ وہ ہمیں اسراف سے محفوظ رکھے اور توفیق عطا فرمائے کہ ہم ذرا سی چیز کو بھی فضول ضائع نہ ہونے دیں۔ کسی چیز کی طرف سے لا پرواہی نہ کریں۔ ذہن میں کسی وقت یہ خیال نہ آئے کہ کوئی شے ہماری مِلک ہے بلکہ ہمیں یہ یقین عطا فرمادے کہ جو کچھ ہے سو اُس کا اور اِس طرح۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۝۶۸ ط یونس (جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کا ہے)۔ پر ایمان لاسکیں اور ہمیں اس امر کی توفیق عطا فرمائے کہ ہمیں یقین حاصل ہو جائے کہ ہمارا نفس، جسم، اعضاء و جوارح سب اُسی کے ہیں جن کی تربیت و اصلاح، اُس کے قوائے باطنی کو ترقی دینا بھی اُسی کی بندگی ہے۔ اس لئے کہ نفس کی غفلت کم ہوئے بغیر تو اُس کی بندگی ہو ہی نہیں سکتی اور لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ مالک کے وجود کا یقینِ قلبی حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مالک کو پکارتے رہیں، اُس سے مدد مانگتے رہیں کہ وہ ہمیں اپنے راستہ پر چلائے۔ نماز و روزے کو صحیح طور پر توجہ قلبی سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ نفس کی اصلاح ہوسکے اور عبادتِ حقیقی کے اہل بن سکیں کہ دنیا کے سب کام ہم اس کا فریضہ سمجھ کر کرنے لگیں اور اس جلیل القدر، عظیم الشان حکومت کے بندے بن سکیں۔

۲

منزلِ عبدیت میں قدم رکھنے کے بعد تمام عزیز واقارب اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے کا اہل ہوجائے گا۔ پڑوس کی تفصیل مولائے کائنات نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:۔

''اپنے مکانِ مسکونہ سے چالیس چالیس گھر چاروں طرف تمہارا پڑوس ہے''۔اور پڑوسیوں کے لئے فرمایا ہے کہ:۔

''اگر کوئی شخص رات کو شکم سیر ہو کر سویا ہوا ہو اور اس کے پڑوس میں کوئی بندۂ خدا بھوک سے کروٹیں بدل رہا ہو تو یہ سیر ہو کر سونے والا خدا پر ایمان ہی نہیں لایا''۔

سبحان اللہ! اگر ہم خدا اور رسولؐ پر ایمان لے آئیں اور حُبّ اللہ سے قلوب منور ہوجائیں تو نفوس میں اتنی اہلیت پیدا ہوجائے کہ اپنے پڑوس کے اتنے علاقہ میں جس کی مولائے امم نے تفصیل بیان فرمائی ہے بندگانِ خدا کی بِلا قیدِ مذہب وملت، بِلا امتیاز رنگ ونسل خبر گیری کرسکیں۔ پھر تو کمیونزم، سوشلزم وغیرہ وغیرہ تمام ان نظاموں میں سے جو آئے دن غافل انسانوں کی رائے اور قیاس سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں کسی نظام کی ضرورت نہ رہے گی اور صرف اسلام ہی دنیا میں امن قائم کرنے کو کافی ہوگا۔

۳

منزلِ عبادت میں ترقی کے ساتھ ساتھ دائرہ عبادت بھی وسیع تر ہوتا جائے گا اور انسانوں کے علاوہ رَبّ العزت کا بندہ حیوانات ونباتات کی بھی خبر گیری کرنے لگے گا۔ اس لئے کہ غلام تو مالک کی املاک میں ہر چیز کی نگرانی اور پاسبانی کرتا ہے۔ اگر ایک جانور پیاسا ہوگا اور پانی صرف اتنا ہی ہو کہ وضو کے لئے کفایت کرسکے تو وہ بندہ جانور کو سیراب کردے گا اور نماز تیمم سے ادا کرلے گا۔

جناب رَبّ العزت ہر کافر ومشرک کو بھی اُسی طرح نعمات ودنیاوی سے سرفراز فرماتا ہے جس

طرح ایک مسلم و مومن کو۔ لہٰذا اُس کا بندہ بھی دوست و دشمن، سب کے ساتھ حُسنِ سلوک کرے گا۔ دشمنوں کو اُن کی مصیبت کے وقت پوشیدہ طور پر مدد پہنچائے گا تا کہ اُن کو شرمندگی نہ ہو یا وہ اس کی نصرت قبول کرنے سے انکار نہ کریں۔

(۴)

مذکورہ بالا کیفیات گو کہ عبدیت کی بہت خاص منازل ہیں مگر ان سے بھی بلند تر ہو سکتی ہیں۔ جس بندے کو عبدیت میں منزلِ اعلیٰ حاصل ہو جائے، اس کی عبادات کی کیفیات ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہیں۔ نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

جتنی منزلِ عبدیت میں ترقی ہوتی جائے گی۔ اتنی ہی عبادت میں بھی ترقی ہوتی جائے گی اور عبد کو معبود کا تقرب حاصل ہوتا جائے گا۔ اِس منزل کے لئے حدیث قدسی میں رب العزت کا ارشاد ہے:۔

> ''جب میرا بندہ نوافل سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں خود اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ میں خود اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ میں خود اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن کو وہ پھیلاتا ہے۔ (وغیرہ تا آخر حدیث)''

اب دیکھنا یہ ہے کہ نفل کس کو کہتے ہیں۔ نفل کے معنی ہیں ''زائد'' مثلاً پانچ وقت کی نمازیں واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو زائد نمازیں پڑھیں وہ نفل ہیں۔ اپنے اہل و عیال کی پرورش فرض ہے۔ اگر دوسروں کے اہل و عیال کی بھی خبر رکھے یہ نفل ہے۔ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا لازم ہے۔ پڑوسیوں میں سے اہل حاجت کے بچوں کو پڑھائے۔ یہ نفل ہے۔ غرض یہ کہ خدمتِ خلق اللہ۔ اللہ کا ذکر بکثرت کرتے رہنا مالک کی محبت کے سبب اس کی مخلوق سے محبت کرنا یہی تقرب کے ذرائع ہیں۔

۵

اب غور کریں کہ اُس بندے کی عبادت کیا ہوگی جو پیدائش سے ہی کمالِ عبدیت پر فائز ہو۔ جو عبدِ کامل ہی پیدا ہوا ہو، وہی تو اس کا نُور، اس کا اَمر، اس کا ارادہ، اس کا کلمہ، اس کا نائبِ حقیقی ہوگا۔ وہی خلیفتہ اللہ ہے، وہی وجہ اللہ ہے، وہی عین اللہ ہے، وہی اذن اللہ ہے۔ وہی لسان اللہ ہے۔ وہی ید اللہ ہے اور خالق ومخلوق کے درمیان واسطہ وحجاب ہے۔ اُس کی مشیت خدا کی مشیت، اور خدا کی مشیت اُس کی مشیت۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴿۳۰﴾ انسان (اور تم تو کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہ جو خدا چاہے) کا مصداق۔ اُس کا کام خدا کا کام۔ وہ دیکھے تو خدا نے دیکھا۔ وہ سُنے تو خدا نے سُنا۔ وہ بیعت لے تو خدا نے بیعت لی۔ وہ سنگریزے پھینکے تو خدا نے پھینکے۔ وہ کچھ کہے تو خدا نے کہا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾ نجم

اور وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہی نہیں وہ تو بس ہماری وحی ہی ہوتی ہے جو وحی کی جاتی ہے

ایسے ہی بندے کو وہ معبودِ حقیقی اپنا عبد کہتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

السجدة سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱﴾ بنی اسرائیل

پاک و پاکیزہ ہے وہ (یعنی وہ ہر نقص وعیب سے منزہ ہے) جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرد و نواح کو ہم نے برکت دی ہے تا کہ اسے اپنی نشانیاں دکھلائے تحقیق کہ وہ بڑا سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى حَبِيْبِكَ وَمَنْزِلِ وَحْيِكَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْحَمْ عَلٰى

مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَاَفْضَلِ مَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ وَ
تَرَحَّمْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ
مَجِيْدٌ